مشائخ فردوسیہ کی علمی وعرفانی خدمات کا ایک مطالعہ

پروفیسر انوار احمد

مرکز تحقیقات فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشائخ فردوسیہ کی علمی و عرفانی خدمات کا ایک مطالعہ

پروفیسر سید انوار احمد

مرکز تحقیقات فارسی
A-4، شبلی روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سرپرست: پروفیسر پی. کے. عبدالعزیز
وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہیئت علمی:

☆ پروفیسر عبدالودود اظہر، سابق ڈین، اسکول آف لینگویجز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
☆ پروفیسر شعیب اعظمی، سابق صدر، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
☆ پروفیسر افضال حسین، شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انتشارات مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نام کتاب : مشائخ فردوسیہ کی علمی و عرفانی خدمات کا ایک مطالعہ
مصنف : پروفیسر سید انوار احمد
اشاعت : ۲۰۰۹ء

مطبع : اے. ایم. یو. پریس، علی گڑھ

فہرست

پیش گفتار

مرکز تحقیقات فارسی کے تحت انجام پانے والے تحقیقی کاموں میں ایک اہم کام برگزیدہ اور منتخب اساتذہ سے فارسی اور اس سے مربوط موضوعات پر تحقیقی مقالہ لکھوانا اور کتاب یا مونوگراف کی شکل میں اس کی اشاعت ہے۔ اس سلسلے میں یہ مرکز کئی اہم موضوعات پر تحقیقی اور تدوینی کام شایع کر چکا ہے۔ مثلاً پروفیسر امیر حسن عابدی، پروفیسر ایمریٹس شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی کا تدوین کردہ صبح صادق کا نسخہ، پروفیسر حافظ محمد طاہر علی صاحب، سابق صدر شعبۂ فارسی وشوا بھارتی، شانتی نکیتن کا ہُفت احکام، شیخ محبّ اللہ الہ آبادی پر تحقیقی مونوگراف، پروفیسر شاہ محمد وسیم، سابق صدر شعبۂ کامرس کا مغل اور صفوی دور کے اقتصادی اور بازرگانی روابط پر مفصل اور مفید مقالہ وغیرہ۔

زیر نظر مونوگراف اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی ہے۔ ہندوستان تصوف اور عرفان کی سرزمین ہے۔ اہم صوفیا اور عرفا نے اپنے کردار و عمل، ملفوظات، اقوال، مکتوبات اور شعر کے ذریعہ اس ملک میں برابری، بھائی چارہ، اخوت اور رواداری کا سبق دیا ہے۔ یہ ان صوفیا کی ہی برکت ہے کہ صدیوں سے کشور ہند مذہب و ملت کے ظاہری اختلاف کے باوجود، یک رنگی، رواداری اور محبت کا علم بردار رہا ہے:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنای محبت کہ خالی از خلل است

پروفیسر انوار احمد صاحب، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی ہماری دعوت

پر علی گڑھ تشریف لائے اور یہاں قیام فرما کر تصوف کے ایک اہم سلسلے یعنی فردوسیہ سلسلے کے مشائخ کی علمی، ادبی وعرفانی خدمات کے تحقیقی وتنقیدی جائزہ پر مبنی یہ مونوگراف مکمل کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا نیا اور انتہائی مفید تحقیقی مقالہ ہے جس میں پروفیسر موصوف نے بڑی دقت نظری اور عرق ریزی کے بعد نتائج برآمد کیے ہیں۔ ہم بے حد ممنون ہیں پروفیسر انواراحمد کے، کہ انھوں نے ہماری درخواست پر یہ موضوع منتخب کیا اور کئی ماہ کی محنت کے بعد اس کام کو انجام دیا۔

امید ہے کہ تصوف اور فارسی شعروادب سے شغف رکھنے والے صاحبان ذوق کی نظر میں ان کی یہ کوشش پُر بار اور مفید ثابت ہوگی اور اس سے مزید تحقیق کی راہیں کشادہ ہوں گی۔

پروفیسر آذرمی دخت صفوی
ڈائریکٹر
مرکز تحقیقات فارسی

مقدمہ

ہندوستان کی تاریخ میں چودھویں صدی عیسوی تصوف کے فروغ وارتقا کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس زمانے میں سندھ، ملتان اور دہلی سے لے کر بہار اور بنگال تک مختلف سلاسل کی صوفی تحریکیں فعال وسرگرم نظر آتی ہیں۔ ذات حق تعالیٰ جس کا دیدار و پندار انسان کے مادی حیطۂ قدرت سے باہر ہے اس کی جستجو یہ صوفیا باطنی بصیرت اور روحانی وجدان کے ذریعہ کرتے تھے۔ چنانچہ صوفیانہ طرز وروش زندگی اس زمانے میں برصغیر کے طول وعرض میں معمول ومتداول تھی۔ صوفیا ایزدسبحان کا عرفان جادۂ عشق پر گامزن ہوکر اور اس کے مراحل ومقامات سے گزر کر کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنے ذاتی روحانی تجربات ومشاہدات کے وسیلے سے ادراک حقیقت ایزدی کا حصول چاہتے تھے۔ کیونکہ عقل وخرد انھیں اس مرام تک پہنچانے سے مجبور ومعذور تھی۔ اس دور میں اسلامی تصوف مسلمانوں کا ایک پسندیدہ مسلک بن گیا تھا۔

ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ نے اپنے ملفوظات ومکتوبات، اذکار وارشاد، ذاتی مجاہدات، تادیب وتہذیب نفس کے ذریعہ نہایت وقیع کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کے جماعت خانے اور خانقاہیں بلاتفریق مذہب ومشرب خلق اللہ کے لیے کھلا رہتا تھا۔ چشتیہ بزرگان بڑے وسیع القلب، بردبار اور روادار ہوتے تھے۔ تنگ نظری، تعصب، خسّت وخصومت سے ان کے دل پاک ومبرّا ہوتے تھے۔ سلسلۂ چشتیہ

بلا شبہ ہندوستان کا مقبول ترین سلسلہ رہا ہے۔ ان کے مشائخ عظام مانند خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکیؒ، بابا فرید، شیخ حمید الدین ناگوری، خواجہ ضیاء الدین نخشبی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت گیسو دراز بندہ نواز کی خدمات جلیلہ نہایت گرانمایہ اور نا قابل فراموش ہیں۔

ان چشتیہ صوفیوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے ادب وعرفان کے میدان میں نہایت بیش قیمت آثار چھوڑے ہیں۔ مثلاً ضیاء نخشبی جن کی تصنیف ''سلک السلوک'' تصوف کے بنیادی نکات ونفائس کو مشروح وموجہ انداز میں بیان کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نخشبی کے آثار میں ''عشرۂ مبشرہ'' اور ''کلیات وجزئیات'' بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ اپنی تصنیف ''طوطی نامہ'' کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں جو چنتامنی بھٹ کی سنسکرت داستان بعنوان ''سوکا سپتتی'' کی فارسی زبان میں منتقل کی ہوئی صورت ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا مجموعہ موسوم بہ ''فوایدالفواد'' جس کے مرتب امیر نجم الدین حسن سجزی تھے، تصوف کی ایک معتبر وموقر کتاب ہے۔ جو حضرت نظام الدین کے احوال واقوال واعمال پر مبنی ہے۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات کا مجموعہ بعنوان ''خیر المجالس'' جس کے جامع حمید قلندر تھے، حضرت نظام الدین اولیا کے ''فوائد الفواد'' سے زیادہ ضخیم ہے۔ جو سو ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی چشتیہ سلسلہ کا ایک لائق ستایش کارنامہ ہے۔ اسی طرح شیخ برہان الدین غریب کا ملفوظ ''احسن الاقوال'' اور حضرت گیسو دراز کے ارشادات کا مجموعہ ''جوامع الکلم'' اور شیخ حسام الدین مانکپوری کا مجموعۂ مقالات ''رفیق العارفین'' چشتیہ سلسلہ کے اہم صوفیانہ کارنامے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے ارجمند مریدوں میں امیر خسرو، نجم الدین حسن دہلوی اور ضیاء الدین برنی بھی تھے۔ امیر خسرو خمسۂ خسروی کے علاوہ پانچ تاریخی مثنویوں کے بھی خالق ہیں۔ ان کے علاوہ ان

کے شعروں کے چار دواوین موسوم بہ ''تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ'' ان کے شعری فضل وکمال کے شاہد ہیں۔ نجم الدین حسن دہلوی حضرت نظام الدین کے نہایت مقرب ومرید تھے۔ وہ صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیں صوری ومعنوی مزایا ومحاسن سے مملو ہیں۔ ضیاء الدین برنی بھی حضرت نظام الدین کے مخصوص ارادتمندوں میں تھے۔ ان کی تصنیف تاریخ ''فیروز شاہی'' اپنے بیش قیمت مشتملات کی بنا پر تاریخ شناسی کے میدان میں ارزش واعتبار کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

چشتیہ سلسلہ کی طرح سہروردیہ سلسلہ میں بھی ایسے مشائخ ظہور میں آئے جنھوں نے تصوف کی تحریک میں درخور تحسین خدمات انجام دی ہیں۔ سہروردیہ سلسلہ کے مؤسس حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص سہروردی تھے۔ ان کی عالی مقدار کتاب ''عوارف المعارف'' حضرت عثمان ہجویری کی تصنیف ''کشف المحجوب'' کے بعد موضوع تصوف پر اہم ترین کتاب ہے۔ سہروردیہ سلسلہ کے ایک دوسرے بزرگ قاضی حمید الدین ناگوری کے آثار مثلاً لوائح ''طوالع الشموس'' اور عشقیہ بڑے گرانقدر کارنامے ہیں۔ ان کے علاوہ فخر الدین عراقی کا دیوان، ان کی مثنوی ''عشاق نامہ'' اور ان کا رسالہ ''لمعات'' جو ابن عربی کے دقیق صوفیانہ مسائل کی توضیح ہے، تصوف کی بیش بہا تصنیفیں ہیں۔ اسی طرح سلسلۂ شطاریہ کے بزرگوں نے بھی تصوف کی تبلیغ اور آثار تصوف کی تصنیف میں نہایت وقیع کارنامے انجام دیئے ہیں۔ تینوں سلاسل کے بزرگوں کی تبلیغی اور تصنیفی مساعی کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

بہار میں فردوسیہ مشائخ کے ارشاد وہدایت کی کوششوں میں ایک لائق توجہ صورت یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے خدا شناسی کے لیے اپنے اعمال تصوف کے اصول ولوازم میں احکام شریعت اور ہدایات دین کو کبھی جدا نہیں کیا۔ اور شریعت کی اولویت کو قائم رکھا۔ یہ صوفیا آفرینش کے مظاہرات کے توسط سے آفرینندہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے

تھے اور اس بات پر یقین کامل رکھتے تھے کہ ذات ایزدی قدیم، لم یزل، انسان کی حد ادراک سے باہر، قادر مطلق اور اوّل و آخر ہے۔ اور اس ذات بے ہمتا کو جلوہ گاہ کائنات کے کسی شے سے مشابہ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ محیط کیہان اعظم اور اس کے اندر کی ہر شے اور ہر کیفیت پر ذات حق کا نور پرتو افگن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ارض و سما یکسر تیرہ و تار ہوتے کیونکہ روشنی انعکاس روشنی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔

ایالت بہار کے لیے چودہویں صدی عیسوی کا یہ دور روحانی تعلیمات کے لیے نہایت معاون و مبارک تھا جب کہ متعدد طالبان حق اخلاقی و روحانی سچائیوں کی دریافت میں شوق و سرگرمی کے ساتھ مشغول تھے۔ اور انھیں ایک عظیم المرتبت صوفی جو اپنے وقت کے صاحب فضل و دانش عالم بھی تھے کے مباحث و مذاکرات سے مستفیض ہونے کا موقع میسر تھا۔ بہار میں اس وقت تغلق سلاطین کی حکومت تھی۔ یہاں ان کی حکومت کا نظام بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔ اس زمانے میں بہار اور ہندوستان کی دوسری ایالتوں میں ابلاغ و اشاعت تصوف کے لیے پرشکوہ اداروں کی تاسیس ہو رہی تھی۔

یہ خانقاہیں، جماعت خانے اور دوسری عمارتیں صرف گردش کرنے والے صوفیوں کی عارضی اقامت گاہیں نہیں تھیں بلکہ یہ مفلسوں، مستمندوں اور معذوروں کے لیے بسیرے بھی ہوا کرتی تھیں۔ اور تاجروں اور سیاحوں کو یہ خانقاہیں عافیت و اقامت مہیا کرتی تھیں۔ تصوف کے ان مراکز میں شریعت، طریقت، فلسفہ، علم تفسیر، فقہ، اخلاقیات اور الٰہیات کا درس دیا جاتا تھا۔ یہ مشائخ اپنی باطنی بصیرت کے تجربات سے ارادتمندوں کو مستفیض کرتے تھے اور ان سے اصول شریعت اور دین و ایمان سے متعلق دوسرے امور پر مباحثے ہوتے تھے اور صوفیوں کے اصول و اطوار بتائے جاتے تھے اور قرآن کریم اور احادیث رسول کریم کے متون کے معانی و مطالب بیان کیے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض صوفیوں پر زہد و ورع کا غلبہ زیادہ ہوتا تھا اور ان کا انہماک و

ارتکاز حق تعالیٰ کی جانب بہت زیادہ ہوتا تھا۔ وہ سخت ریاضتیں کرتے تھے اور جسمانی مشقتیں اٹھاتے تھے اور گوشۂ انزوا اختیار کر لیتے تھے۔ اور بعض صوفیا کا میلان سماع کی طرف ہوتا تھا۔ وہ معنی خیز ودل انگیز ابیات کو قوّالوں کی نغمہ ریز دھنوں میں سماعت کرتے تو ہوش وحواس کھو بیٹھتے تھے۔ ایک مستی ووارفتگی کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ اور سماع کو اس بنا پر یہ صوفیا وصل بہ حق تعالیٰ کا ایک وسیلہ تصور کرتے تھے، اور دایماً یہ بزرگان اپنے ارادتمندوں کو صادق القول، راست رو، پاک سرشت اور پرہیزگار رہنے کی نصیحت فرماتے تھے۔ اس دور میں بہار میں سیاسی استواری، معاشی خوشحالی اور امن وآشتی کا ماحول تھا۔ حضرت مخدوم جہاں شرف الدین احمد جنگلوں اور پہاڑیوں میں سخت ریاضتوں کی تکمیل کے بعد خلق اللہ کے قریب آ گئے تھے اور بہار شریف میں سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ یہاں آنے کے بعد وہ لوگوں کی تربیت واصلاح میں مشغول ہو گئے اور علوم ظاہری وباطنی کی تعلیمات سے ان کو فیضیاب کرنے لگے۔

حضرت مخدوم نہ صرف فقہ واصول دین اور عرفانی نکات کو اپنی سخن‌رانیوں کا موضوع بناتے تھے، مختلف نظریات وعقاید کی بھی توضیحات بیان کرتے تھے۔ عقاید دین اور علوم الٰہی سے متعلق حضرت مخدوم الملک کی خدمات شمار ومعیار دونوں اعتبار سے شایستۂ توجہ ہیں۔ ملفوظات ومکتوبات کے علاوہ طریقت وشریعت کے اہم موضوعات پر نہایت گرانقدر رسالے لکھے۔ ان کا تبحر علمی برصغیر میں کم نظیر تھا۔ اگر وہ صرف مکتوبات صدی اور 'شرح آداب المریدین' ہی لکھتے تو بھی انھیں دائمی شہرت حاصل ہو جاتی۔ حضرت مخدوم کی تصنیفات کا مشروح جائزہ آیندہ صفحات میں لیا جائے گا۔

روحانی تجربات وبصیرت کے رفیع ووالا مقام پر پہنچ جانے کے بعد بھی وہ شریعت کے زبردست پاسدار تھے۔ انھیں شہرت ونام آوری سے بڑی وحشت ہوتی تھی اور حصول زر ومال کی ذرّہ برابر بھی ہوس ان کے دل میں نہیں تھی۔ خانقاہ کو عطا کی گئی

جائداد کی سند کو انھوں نے دہلی جا کر سلطان فیروز شاہ تغلق کو واپس کر دیا تھا۔ یہ ان کی شان استغنا، قناعت اور مال ومتاع سے بیزاری کا ثبوت ہے۔ حضرت مخدوم کی شخصیت نہایت متوازن ومحتاط تھی۔ تصوف تو تطہیر دین وایمان کا ایک معتبر طریقہ ہے۔ اسے وہ دین کے اساسی احکام سے جدا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ عقل وخرد کو اشاعت دین کے لیے صحیح طور پر استعمال میں لاتے تھے۔ لیکن عقل کے استبداد وحاکمیت پر انھیں یقین نہیں تھا۔ کیونکہ وصلت حق تعالیٰ کی منزل عقل کی سرحد سے بہت آگے ہے۔

حضرت مخدوم الملک کرامات کے قائل نہ تھے۔ کرامات کو صوفیانہ بزرگی کی علامت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ صوفیا کو کرامات کے اظہار سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ان کی یہ خصوصیت ہندوستان کے تمام سلاسل کے بزرگوں میں ان کی ممتاز حیثیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ چشتیہ بزرگوں میں کرامات کے مظاہرے کی رغبت سب سے زیادہ حضرت بختیار کاکیؒ کی طبیعت میں تھی جس کو ان کے پیر خواجہ معین الدین چشتی پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت مخدوم جہاں نے ایک طویل عرصے تک، شاید بارہ برس تک مقامات معنوی تک رسائی کے لیے نفس سے مجاہدہ کرتے رہے اور مشقات بدنی سے تمایلات نفس کو مغلوب کرتے رہے اور بلاشبہ ایسی ریاضت وصعوبت کا انعام انھیں معرفت ومحرمیت حق تعالیٰ کی شکل میں ملا۔ لیکن اپنے ان ذاتی مجاہدات اور ان کی بنا پر روحانی تجربات ومشاہدات کا ادعا انھوں نے اپنی تحریروں میں نہیں کیا ہے۔ ان کی طبیعت شطحیات سے یکسر مجتنب رہتی تھی۔ ایک بار انھوں نے اپنے نہایت برگزیدہ مرید مولانا مظفر بلخی سے کرامات کے اظہار کے سبب رنجیدہ بھی ہوئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایسی فروتنی اور عاجزی تھی کہ ایک مرتبہ مولانا مظفر بلخی سے اس لیے آزردہ ہوگئے تھے کہ وہ اپنے فضل ودانش کے زعم میں بہار کے علما سے مناظرہ ومجادلہ کر بیٹھے تھے اور بہاری علماء کی ہر بات پر ''لانسلم'' کہتے تھے یعنی (میں نہیں مانتا)۔

حضرت مخدوم الملک اپنے مکتوبات وملفوظات میں سلوک وطریقت، احکام شریعت، فرائض ونوافل، اوراد ووظائف، جبر وقدر، مشیت الٰہی اور دیگر موارد تصوف مانند توکل، صبر، قناعت، مجاہدہ ومراقبہ کو شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حضرت مخدوم کے مباحث ومقالات سے علوم دین میں ان کے تعمق ومہارت کا اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ہی باطنی بصیرت میں ان کے استغراق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ظاہری اور باطنی دونوں طرح کے علوم میں فوق العادہ تبحر اور عبادت وریاضت میں ایسی محنت ومشقت اور اپنی جانب فریفتہ کرنے والے جلوہ ہای رنگ رنگ اور جاہ ومنزلت اقتدار وثروت سے اکراہ وانزجار کی ایسی مثال برصغیر میں حضرت عثمان ہجویری کے علاوہ کسی دوسرے صوفی کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ فردوسیہ سلسلہ کو ارتقا کی راہ پر لے جانے والے اس صوفی باصفا نے طریقت وتصوف کا نہایت بلند معیار پیش کیا تھا۔

ان کے بعد منصۂ ظہور پر آنے والے فردوسیہ مشائخ مثلاً حضرت مولانا مظفر بلخی حضرت نوشہ توحید، حضرت احمد لنگر دریا اور حضرت امین احمد ثبات وغیرہ نے حضرت مخدوم شرف الدین احمد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی مشقت ومجاہدت اور فضل وکمال کی برکت سے اس سلسلے کے وقار ومعیار کو قائم رکھا۔

تصوف نے فارسی شاعری کو ایک مخصوص طرز تفکر کی راہ پر لگایا۔ صوفیانہ شاعری سے جس کا موضوع عشق معشوق حقیقی ہوتا تھا اس کے لغات ولفظیات، اصطلاحات وتلمیحات، تشبیہات وکنایات بلکہ معنی وبیان کے سارے وسائل وہی ہوتے تھے جن کو شعراء عشق مجازی کے بیان کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ ہر صوفی شاعر جس کا مدعا ومقصود محبوب ازلی ہوتا ہے، اس کا کلام جام وسبو، خم وایاغ، شراب وساقی، پیالہ وپیمانہ، گیسو وابرو، لب ورخسار، ناز وکرشمہ، غمزہ وعشوہ سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ زندگی کی قدروں میں تبدیلی اور دنیا کے اجتماعی اور سیاسی احوال میں تغیر کے سبب صوفیانہ شاعری

زوال وانحطاط کے راستے پر چلی گئی۔ اور اب ایسے اشعار کہنے والے اور ایسے اشعار سننے والے معدوم ہو چکے ہیں۔

خانقاہوں کو پستی و زبوں حالی سے قریب کرنے میں فریب کار صوفیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ سائنس کی روشنی نے انسان کو ضعیف الاعتقادی کی لعنت سے نجات دلا دی ہے:

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

☆☆☆

تصوف کی ماہیت و حقیقت اور ہندوستان میں اس کا ورود

بحری راستے سے سفر کرنے والے عرب تجار نے جو لنکا اور مالابار کے ساحلی علاقوں میں اپنے تجارتی مقاصد کے لیے آمد و رفت کرتے تھے، سب سے پہلے برصغیر کے اس حصے میں دین اسلام کو متعارف کیا۔

۷۱۰ء میں محمد بن قاسم نے مکران اور بلوچستان کو اپنے تحت تصرف کرلیا تھا اور ۷۱۱-۱۲ء کے عرصہ کے درمیان وہ سندھ کو اپنے حیطۂ تسلط میں لے چکا تھا۔ اور اس کے بعد خطّہ ملتان تک اس نے اپنے غلبہ و اختیار کی توسیع کی۔ اسی طرح قتیبہ بن مسلم نے ماوراء النہر کو ۷۰۵-۷۱۵ء کے درمیان زیر نگیں کرلیا جس کے نتیجے میں بلخ، بخارا، سمرقند، خوارزم اور فرغانہ وغیرہ شہروں میں عربوں کی حکمرانی شروع ہوئی۔ اگرچہ ماوراء النہر اور خراسان کے علاقوں میں تصوف کی ترقی و ترویج کی اطلاعات مأخذوں میں مذکور ہیں لیکن سندھ کے دیار میں تصوف کے فروغ و پیشرفت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ سندھ پر غلبہ حاصل کرنے والے عرب فاتحوں کی ایک خاص تعداد اپنے خانوادوں کے ساتھ یہاں کے مختلف شہروں میں سکونت پذیر ہوگئی۔ بہت سارے غیر مسلموں نے مختلف موجبات کی بنا پر دین اسلام کو قبول کیا تھا۔ مثلاً اس علاقے کے کچھ برہمن جو حکومت کے اعلیٰ مناصب پر مامور تھے، اپنی حیثیت و مرتبت کو بحال رکھنے کے لیے دین اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے۔ جب کہ بودھ مت ماننے والوں کی ایک بڑی جماعت جو ہندوؤں کی قدرت و بالادستی کی مخالف تھی اور در پردہ برہمنوں کی قدرت و شوکت کے

انقراض کے لیے بیرونی حملہ آوروں کی حمایت میں تھی مشرف بہ اسلام ہوگئی۔ عرب تاجروں کی کوششوں سے بھی بہت سارے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

بہر حال عربوں کے توسط سے اس دیار میں دین اسلام کی لائق تحسین تبلیغ ہوئی۔ لیکن یہاں اس دور میں صوفیانہ تعلیمات کے ابلاغ وارشاد کے نشانات نہیں ملتے۔ سرزمین سندھ میں صوفیوں کے شغل وعمل سے متعلق معلومات کے فقدان کے کچھ اسباب ہیں مثلاً خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ جہاں صوفیانہ تحریک ارتقائی سفر پر تھی اور سندھ کے مابین آمد ورفت اور نقل وحمل کا راستہ نہایت دشوار اور توان فرسا تھا، اور دوسرا سبب یہ ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں جب مشرب تصوف تدریجاً وسعت وارتقا کے مراحل سے گزر رہا تھا تو یہی زمانہ مصر میں فاطمی خلافت کے عروج کا تھا۔ اور ۹۷۷ء سے ۹۸۵ء تک ملتان فاطمیوں کے اختیار میں رہا اس لیے تصوف جو اساساً جماعت اہل سنت کی تحریک تصور کیا جاتا تھا اسماعیلیوں کے قبضہ وغلبہ کی اس سرزمین میں اس کا رشد ونمو محال تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں سکّان سندھ کا رشتہ خراسان وماوراء النہر کی ایالتوں سے جہاں تصوف اعتلا کی راہ پر چل رہا تھا منقطع ہوگیا تھا۔ لیکن ۱۰۰۴ء سے ۱۰۱۱ء تک سلطان محمود غزنوی کی متواتر یورشوں کے زیر اثر ملتان پر فاطمیوں کا دبدبہ وقبضہ بہت حد تک بے اثر ہوگیا لیکن ملتان پر سلطان محمود کا نفوذ دیرپا ثابت نہیں ہوا کیونکہ اسماعیلیوں کو مکمل طور پر مغلوب ومستأصل کر دینے کا موقعہ اسے کچھ اسباب کی بنا پر نہیں ملا تھا۔ اسماعیلی کماکان السابق منصورہ اور ملتان میں اپنی قوت بڑھاتے رہے۔ لیکن ڈیڑھ سو سال کے بعد ۱۱۷۵ء میں معز الدین محمد غوری نے ملتان کو مستحکم طور پر اپنے تصرف میں کر لیا۔ بارہویں صدی عیسوی کے اختتام کے بعد سندھ کا بڑا علاقہ سنی مسلمانوں کے تحت تسلط ہوگیا لیکن ایسے شواہد موجود ہیں کہ گیارہویں صدی عیسوی کے وسط سے ہی تصوف ملتان کے اطراف وجوانب میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ پہلے صوفی جس نے اس سرزمین میں سکونت اختیار کی وہ شیخ صفی الدین کازرونی تھے۔ شیخ موصوف شیراز کے قریب واقع قصبہ کازرون کے باشندہ

تھے اور شیخ ابواسحاق کازیرونی متوفی ۱۰۳۵ء کے برادرزادہ اور خلیفہ تھے۔ اپنے عم محترم ابواسحاق کازیرونی سے سند خلافت کے حصول کے بعد شیخ صفی الدین ارشاد وہدایت کے مقصد سے اُچ چلے آئے تھے۔ اُچ میں شیخ صفی الدین کازیرونی کی صوفیانہ فعالیتوں کی کوئی اطلاع دستیاب نہیں ہے، بجز حضرت نظام الدین اولیا کی بیان کردہ حکایت کے جس میں حضرت نے شیخ موصوف اور ایک جوگی کے مابین روحانی صلاحیت ورفعت کے مقابلہ ومواجہہ کا ذکر کیا ہے اور روحانی طاقت کے معارضہ میں دیگر صوفیوں کے مانند ہندو مرتاض پر فوقیت حاصل ہوئی تھی۔ پنجاب کو جب محمود غزنوی نے اپنے دائرۂ سلطنت میں شامل کرلیا تو اس سازگار ماحول میں متعدد عرفاء وصوفیا مختلف علاقوں سے کوچ کر کے ابلاغ وارشاد تصوف کے لیے اس دیار میں چلے آئے۔ مثلاً ابوالفضل محمد بن حسن ختالی کے حکم سے ان کے مرید شیخ حسین زنجانی پنجاب میں وارد ہوئے۔ اس کے بعد ابوالفضل محمد بن حسن نے ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری کو زنجانی کے عقب میں پنجاب روانہ کیا۔ زنجانی ہنگام شب لاہور پہنچے تھے۔ جب صبح ہوئی تو زنجانی کا جنازہ تدفین کے لیے تیار تھا۔ شب ہی میں وہ دنیا چھوڑ چکے تھے۔

عثمان ہجویری کا ورود مسعود لاہور میں ۱۰۳۵ء میں ہوا تھا جب سلطان مسعود غزنہ میں اورنگ نشیں تھا۔ ہجویری کا تولد غزنہ میں ۱۰۰۹ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے متعدد صوفیا ومشائخ کے حضور میں اکتساب فیض و دانش کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کے اسمائے گرامی کا ذکر اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں کیا ہے۔ مثلاً ابوالقاسم گرگانی، خواجہ مظفر، ابوالعباس محمد اشقانی۔ لیکن ختاتی جو شام کے رہنے والے تھے حضرت ہجویری کے خاص معلم تھے۔ لاہور میں بودوباش اختیار کرنے کے بعد بھی ہجویری نے ماوراء النہر، خراسان اور شام کے صوفیوں سے روابط برقرار رکھے۔ انھوں نے دوبار طویل مسافتوں کے سفر کیے۔ ۱۰۶۷ء کے بعد ہجویری لاہور لوٹ آئے اور تمام زندگی لاہور ہی میں گزار دی۔ اور تادم حیات اسی شہر میں رہے۔ ان کے مرقد اقدس پر جو مادّہ تاریخ وفات تحریر کیا ہوا

ہے اس سے ۴۶۵ھ متخرج ہوتا ہے:

خانقاہِ علی ہجویریست خاک جاروب آن درش بردار
چونکہ سردارِ ملک ومعنی بود سالِ وصلش برآید از 'سردار'

لیکن نکلسن کا خیال ہے کہ ہجویری کی وفات ۴۵۹ اور ۴۶۵ھ کے درمیان کے کسی سال میں ہوئی ہوگی۔ انھوں نے آذربائیجان، بسطام، دمشق، رملا، بیت الجن (شام) مرو وسمرقند وغیرہ مقامات کا سفر کیا تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے ان کے روضہ پر چلّہ کشی کی تھی۔ ان کے آثار جن کا ذکر انھوں نے ''کشف المحجوب'' میں کیا ہے ان میں سے کچھ کے نام بقرار ذیل ہیں: منہاج الدین'' جس میں اہلِ صفہ کے احوال تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور اس میں حسین بن منصور حلاج کی سرگذشت حیات بھی شامل ہے، کتاب فنا وبقا، بحر القلوب وغیرہ۔

ہجویری کی ''کشف المحجوب'' پہلی کتاب ہے جو تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کیا تھا۔ انھوں نے اس موضوع سے متعلق عربی زبان میں موجود بیشتر مأخذ ومنابع سے استفادہ کیا تھا۔ کشف المحجوب کا وہ باب جس میں صوفیوں کے مختلف سلاسل کے عقاید و نظریات بیان کیے گئے ہیں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ہجویری نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ لاہور کے کچھ صوفیا ان کی کتاب کے محتویات کے سخت مخالف تھے اور اس کے سبب ان سے عناد وعداوت کا غبار دل میں رکھتے تھے۔ چنانچہ ہجویری اپنے آپ کو ایسے نامساعد ماحول میں مقید ومجبور تصور کرتے تھے۔ یہ بیش بہا کتاب اسلامی تصوف کی چند برگزیدہ تالیفات میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مشتملات معاصر صوفیا کے احوال، اہل تصوف کی مختلف شاخیں، ہر سلسلہ کے اصول وقواعد سے متعلق مطالب موجود ہیں۔ یہ کتاب لسانی اعتبار سے بھی لائق توجہ ہے۔ کتاب ہذا میں عصری لغات ولفظیات، عبارتوں کی مخصوص ساخت وترکیب اور طرز بیان کی انفرادیت کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ

لغوی اور لسانی اختصاصات اس کتاب کو دوسری تالیفات سے متمائز کرتے ہیں۔ اس کتاب کی تمام ظاہری اور معنوی مشخصات، جو فرہنگ و ثقافت کے عوامل و عناصر سے آمیختہ ہیں، قاری کو طہارت فکر وعمل کے لیے انگیز کرتی ہیں۔

''کشف المحجوب'' پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ شرح تعرف مستملی واحد صوفیانہ کتاب ہے جو اس تصنیف سے قبل کلابادی کے التعرف کے ترجمہ وتوضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مندرجات میں تصوف سے متعلق کچھ ایسے مطالب بھی ہیں جو دوسری صوفیانہ تصنیفوں میں نہیں ملتے ہیں۔ مثلاً خرقہ پوشی کے آئین، ملامت و ملامتیان وغیرہ۔ پانچویں صدی کے صوفیا کے احوال کی اطلاعات، صوفیوں کے مختلف فکری گروہوں سے متعلق تفصیلات کے لیے کشف المحجوب، نہایت معتبر اور منحصر بہ فرد کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے وسیلے سے قارئین کو حقائق دین کے ادراک و افہام، دین وعبادت کے آداب واطوار اور تصوف کے اور بہت سے امور کو سمجھنے اور ان کو عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس سبب سے بھی ہے کہ ہجویری نے اپنی مدت حیات کا بیشتر حصہ سفر میں گزارا تھا اور دنیائے اسلام کے بزرگتر حصہ کا اسی اثنائے سفر میں مشاہدہ کیا تھا۔ اور اپنے اسفار کے تجربات وخاطرات اور مختلف ارباب تصوف سے ملاقات کے نتائج کو انھوں نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ مثلاً سفر کے دوران کی ان کی ملاقات احمد حمادی سرخسی سے ہوئی تھی جو ایک خداشناس بزرگ تھے۔ تمام عمر انھوں نے تجرّد کی زندگی گزاری۔ ان کی صحبت و ملاقات سے ہجویری بہرہ مند ہوئے تھے۔ انھوں نے بغداد کے اطراف میں منصور حلاج کے عقیدت مندوں سے بھی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی لسانی خصوصیتوں میں یہ بات شایستۂ توجہ ہے کہ مصنف کتاب کے ان ابواب میں جہاں وہ اپنے فکر وسخن کی تائید واثبات میں حکایت بیان کرتے ہیں تو ان کی زبان بول چال کی زبان ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس زمانے میں مروج زبان کے الفاظ اور مقامی بولیوں کی مثالیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ اس کے

علاوہ یہ فارسی کی اوّل کتاب ہے جس میں مصنف نے تصوف کی اصطلاحات کی توضیح کی ہے اور اس بات کی سعی کی ہے کہ کتاب میں عربی کی اصطلاحات تصوف کے فارسی معادل پیش کیے جائیں ۔ یہ کتاب ان مختصات کے سبب عصری الفاظ و لغات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے اور فارسی زبان کی تاریخ میں اس کی حیثیت مسلّم ہے ۔ یہ کتاب تصوف کے جملہ امور کو بیان کرتی ہے مثلاً پاکی، راستی، بی نیازی، استغنا، قناعت ومناعتِ طبع وغیرہ۔اس کتاب کی ایک حکایت مثالاً پیش کی جاتی ہے:

> ''شیخ ابو طاہر حرمی روزی برخری نشستہ بود ومریدی از آن وی عنان خرہ گرفتہ بود، اندر بازار میرفت و یکی آواز داد آن پیر زندیق آمد. آن مرید چون آن سخن شنید از غیر ارادت خود رجم آن مرد کرد واہل بازار ہم جملہ بشوریدند. شیخ گفت مر مرید را اگر خاموش باشی من ترا چیزی آموزم کہ از این سخن باز رہی .مرید خاموش بود. چون بہ خانقاہ خود باز رفتند این مرید را گفت آن صندوق بیار چون بیاورد درزہ بستہ ہای نامہ بیرون گرفت و پیش وی افکند و گفت نگاہ کن از ھمہ کس بہ من نامہ ھا است کہ فرستادہ اند. یکی مخاطبہ شیخ امام خمینی کردہ است و یکی شیخ زکی و یکی شیخ زاہد و یکی شیخ الحرمین واین ہمہ القاب است نہ اسم ومن این ہمہ نیستم .ہرکس بہ حسب اعتقاد خود سخنی گفتہ اندومرالقبی نہادہ اند اگر آن بیچارہ نیز برحسب اعتقاد خود سخنی گفتہ اند این ہمہ خصومت چرا انگیختی.''

ہجویری نے اصطلاحات تصوف کی جو توضیحات بیان کی ہیں ان میں سے کچھ مثالیں بقرار ذیل ہیں:

اہل تجرید: وہ اصحاب ہیں جو تعلقات مادی، علائق طبیعی اور مہالک حسی سے اپنے آپ کو

محفوظ کر لیتے ہیں اور وہ شے جو انسان کو سعادت و مقامات عالی کی منزل کی رسائی میں مانع ہوتی ہو اس سے مکمل جدائی اختیار کر لیتے ہیں۔

تلبیس: کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف لوگوں کو دکھانا، مثلاً ریا، نفاق وغیرہ۔

حال: ایک خاص وقت پر مخصوص کیفیت کا کسی پر استیلا اور اس کے زیر اثر تغیرات کو توازن کی حدوں میں رکھنا جس طرح روح جسم کو اپنی یکسر متغائر نوعیت کے باوجود اعتدال کی حد میں رکھتی ہے۔

حقیقت: اس امر سے عبارت ہے کہ جس میں تغیر وتبدل کے ورود کا کوئی سوال نہ ہو۔ آدم سے لے کر فنائے عالم تک اس کی حیثیت مساوی ہو۔ لیکن شریعت عبارت ہے اس امر سے جس میں نسخ وتبدیل کی گنجائش ہو۔ لیکن احکام شریعت حقیقت کی روشنائی سے مستفیض ہوتی ہے اور رشد و ہدایت کی راہ متعین کرتی ہے۔ لیکن اقامت حقیقت شریعت کی پاسداری کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ حقیقت روح ہے، شریعت جسد ہے۔ شریعت کا تعلق مکاسب سے ہے جب کہ حقیقت کا سرچشمہ مواہب ہے۔

خرقہ: جامۂ خلقان- وہ لباس جو صوفیا پہنتے ہیں۔ ہجویری کہتے ہیں کہ یہ لباس مرشد کی قبولیت کا نشان ہے۔ اس کی اقسام ہیں مثلاً خرقۂ ارادت، خرقۂ تبرّک، خرقۂ نصرت اور خرقۂ توبہ وغیرہ۔

راجعان: ان کو کہتے ہیں جو طریقت سے لوٹ کر ارشاد خلق کے لیے عوام کے درمیان چلے آتے ہیں۔

صلوٰۃ: ہجویری کہتے ہیں کہ نماز ایسی عبادت ہے کہ آغاز سے انجام تک راہ حق پر چلنے والوں کو پابند رہنا پڑتا ہے۔ مثلاً طہارت مریدوں کے لیے توبہ ہے۔ پیر سے تعلق قبلہ کی جگہ ہے۔ قیام مجاہدت نفس کے لیے ہے۔ قرأت کا موقعہ ذکر دائم کے لیے ہے۔ اور رکوع کا مقام تواضع کے لیے ہے۔ سجود معرفت نفس کے لیے ہے۔ تشہد مقام انس ہے۔ سلام تفرید کا موقع ہے۔

طوارق: صوفیانہ اصطلاح میں وہ چیز جو بشارت یا زجر و توبیخ شب کی مناجات میں دل میں وارد ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ وہ چیز جو سامعہ کے ذریعہ اہل حق کے قلوب پر وارد ہوتی ہو اسے طوارق کہتے ہیں۔

طہارت: طہارت صوفیان عبارت ہے اخلاق ذمیمہ اور محبت دنیا سے نفس کا تزکیہ کرنا۔

مسامرہ: افسانہ گفتن- عارفوں کی نظر میں عالم اسرار وغیب میں خطاب حق تعالیٰ کی سماعت- بندے کا مسامرہ حق تعالیٰ کے ساتھ شب میں ہوتا ہے۔ کیونکہ شب دوستوں کی خلوت کا وقت ہوتی ہے۔

معرفت: بیزاری وروگردانی از غیر حق:

الصوفی: صوفی وہ ہے کہ جب وہ کلام کرتا ہو تو اس کا بیان اس کے حقائق حال کا ترجمان ہو۔ صوفی وہ ہے جو اپنے آپ میں فانی ہو اور باقی باللہ ہو۔ خواہشات سے آزاد ہو اور حقائق کی اصلیت سے وابستہ ہو۔ اور متصوف وہ ہے جو صوفی کے درجہ تک رسائی کا طالب ہو اور مستصوف وہ ہے جو مال و جاہ کے لیے صوفی اور متصوف کی نقل کرتا ہو۔

یقین: یقین کے تین مراتب ہیں- علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم الیقین دنیا کے معاملات کا علم ہے، احکام واوامر دین کے مطابق۔ عین الیقین، حالتِ نزع میں علم یعنی دنیا سے رخصت ہونے کے وقت کا علم- حق الیقین یعنی کشف رویت اندر بہشت۔ لہٰذا علم الیقین علماء کا درجہ ہے۔ عین الیقین عارفوں کا مقام ہے اور حق الیقین دوستوں کی فنا گاہ ہے۔ علم الیقین مجاہدت سے عین الیقین موانست سے اور حق الیقین مشاہدت سے حاصل ہوتا ہے۔ اول عام ہے دوم خاص ہے اور سوم خاص الخاص ہے۔

تصوف باب تفعل میں صوفی کا مصدر ہے بمعنی صوف پوشیدن یعنی پشمینہ پوشی جس طرح واژہ تقمص اسی باب میں قمیص سے بنا ہے۔ جس کے معنی پیراہن پوشیدن ہے۔

کلمۂ صوفی اور تصوف کی متعدد مشتق صورتوں میں اس کو صوف سے منسوب کرنا (بمعنی پشم) عربی قواعد کے لحاظ سے زیادہ قابل قبول ہے۔ ابوالقاسم قشیری پانچویں صدی ہجری کے معروف صوفی وعارف اپنے رسالہ قشیری میں لکھتے ہیں:

''واین نام غلبہ گرفتہ بر این طایفہ، گویند فلان صوفی است وگروھی را متصوفہ خوانند و ہر کہ تکلف کند بدین رسد اورا متصوف گویند واین اسمی نیست کہ اندر زبان تازی اورا بازتوان یافت یا از آن اشتقاق است و ظاہر ترین آن است کہ لقب است چون لقب ہای دیگر، اما آنکہ گویند این از صوف است و تصوف صوف پوشیدن است چنانکہ تقمص پیراہن پوشیدن است این روی بود''

لیکن ہجویری اپنی کتاب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں:

''اندر تحقیق این اسم بسیار سخن گفتہ وکتب ساختہ وگروہی گفتہ اند کہ صوفی خوانند کہ تولی بہ اصحاب صفہ کنند وگروہی گفتہ اند کہ این اسم از صف مشتق است امابر مقتضی از این بعید می نماید۔''

بہر حال 'پشمینہ پوشی' زہد وتقویٰ اور دنیا سے بے اعتنائی کی علامت ہے اور تصوف ترک دنیا، زہد وقناعت کا طریقۂ زیست ہے۔ اولین صاحب دل بزرگ جو بعنوان صوفی مشہور ہوئے، ابو ہاشم صوفی متوفی ۱۵۰ھ تھے۔ ابن خلدون کے خیال کے مطابق تصوف اپنے مخصوص عنوان کے ساتھ دوسری صدی ہجری میں ظہور میں آ چکا تھا۔ شبلی کہتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو دونوں جہان میں بجز خدا کے کسی شے کی طرف توجہ نہ کرے۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ تصوف آٹھ خصلتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے جو بقرار ذیل ہیں:

سخا، رضا، صبر، اشارہ، غربت، پوشش پشمی، سیاحت اور فقر۔

مسلم مصنفین تصوف کو اسلام کی باطنی تعلیم سے منسوب کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ تصوف کا نو افلاطونیوں کے مکتب سے تعلق ہے۔ افکار افلاطونی جو شہر اسکندریہ میں تیسری صدی میں مروج تھے وہ یہی تصوف ہے جو عشق پر مبنی ہوتا ہے۔ ایسا عشق جس کو عالم محسوسات کے عشق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ عشق حقیقت معنوی تک پہنچنے کا ایک وسیلہ سمجھا گیا۔ وصل خداوند تبارک وتعالیٰ کی حصولیابی کا ایک ذریعہ تصور کیا گیا۔ مفکروں کا ایک گروہ تصوف کو ہندومت کے فلسفۂ ویدانت سے قریب پاتے ہیں اور اس کے نشو ونما کا میدان کشور ہند کو قرار دیتے ہیں۔ کچھ دانشوروں کا یہ نظریہ لائق توجہ ہے کہ تصوف کے اطوار واصول اور ہندوستان کے سنتوں اور رشیوں کے دھیان، گیان، مراقبہ اور خدا کی جانب یکجہت ہو کر متوجہ رہنے کے آداب میں بڑی مشابہت ہے۔ خصوصیت سے تصوف کا بھگتی کے تصور سے نزدیکی قابل لحاظ ہے۔ دونوں عقیدے مذہبی احکام وتشریفات کی انجام دہی میں عشق کی قوت وتاثیر پر توجہ دیتے ہیں اور تکلفات وتصنعات کی زیادہ فکر نہیں کرتے ہیں۔ سنتوں، بیراگیوں اور ہندو مرتاضوں کے مماثل افکار واعمال کی بنا پر مسلمان صوفیوں نے ان کی ایک کثیر تعداد کو اپنی طرف مائل کیا تھا۔

اس ملک میں بہت ساری اصلاحی و دینی تحریکیں صوفیوں کے افکار وآراء کے تحت تاثیر وجود میں آئیں۔ مثلاً سکھوں کا مذہب جس پر اسلامی تصوف کے قواعد واصول کا گہرا اثر ہے۔ ان کے یہاں لنگر کا رواج یعنی فقیروں محتاجوں کو کھانا کھلانے کی رسم وروش صوفی مشائخ کی خانقاہوں کی تقلید میں شروع ہوئی۔ اسی طرح رادھا سوامی کے مکاتب میں گروؤں کی تعلیمات پر صوفیوں کے افکار کا نفوذ وغلبہ نظر آتا ہے۔

صوفیوں نے متنوع طریقوں سے تصوف کی توضیحات بیان کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ابوسعید ابوالخیر کی توضیح نہایت جامع ہے۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ ذہن میں کچھ بھی ہو اس کو الگ کر دیجئے، اس سے بے تعلق ہو جائیے اور جو کچھ بھی تمہارے پاس ہو اسے دوسروں کو دے دیجئے۔ اور جو واقعہ بھی تمہاری زندگی میں وقوع

پذیر ہوان کو تسلیم کیجئے۔ انسان کو اپنے فضل و دانش پر ناز اں نہیں ہونا چاہیے۔ قوت ادراک کے وسیلے سے حاصل کیا ہوا فضل و ہنر صوفی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غزالی ''کیمیائے سعادت'' میں لکھتے ہیں:

''علم حجاب است از این راہ و مثل دل چون حوضی
است و مثل حواس چون پنج جوی است کہ آب از وی بہ حوض میآید
از بیرون۔ اگر خواهی کہ آب صافی از قعر حوض برآید، تدبیر آنست
کہ این آب جملہ از وی بیرون کنی وگل سیاہ کہ از اثر این آب
است ہم بیرون کنی وراہ ہمہ جو یہابندی تا آب نیز نیاید- وقعر حوض
ہم کنی تا آب صافی از درون حوض پدیدار آید تا حوض بدان آب
کہ بیرون آمدہ است مشغول باشُ ممکن نشود کہ از دون وی آب
برآید۔ ہمچنین این علم کہ از درونِ دل برون آید حاصل نیاید تا از
ہر چہ از بیرون درآمدہ است خالی نشود۔''

لہٰذا وہ علم جو دل کی گہرائی سے باہر آتا ہے اس کا حصول آسان نہیں ہے تاوقتیکہ بیرونی علم کی دسترس سے طالب علم آزاد نہ ہو جائے۔ پس واضح ہے کہ علم معنوی کا منبع و سرچشمہ انسان کا قلب ہے۔ مولانا روم نے اپنی مثنوی کی ایک حکایت بعنوان ''فیل درخانۂ تاریک'' میں اس حقیقت کو نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔

پیل اندر خانۂ تاریک بود	عرضہ را آوردہ بودندش ہنود
از برای دیدنش مردم بسی	اندر آن ظلمت ہمی شد ہر کسی
دیدنش باچشم چون ممکن نبود	اندر آن تاریکیش کف می بسو
آن یکی از کف چو بر پایش بسود	گفت شکل پیل دیدم چون عمود
آن یکی را کف بہ خرطوم اوفتاد	گفت ہمچو ناودانست این نہاد

☆☆☆

ہندوستان میں تصوف کے بعض سلاسل کا اجمالی جائزہ

بارہویں صدی عیسوی میں صوفیانہ افکار اپنے اختصاصی عناصر کی وجہ سے متشخص وممیز صورتوں میں تبدیل ہونے لگے، جن کی بنا پر نئے سلاسل وجود میں آئے۔ ہر سلسلہ ایک مخصوص طرز فکر کی نمایندگی کرتا تھا۔ صوفیوں کی انفرادی سیرت وشخصیت، ان کے علم و عرفان اور رشد وہدایت سے متعلق واقفیت سلسلہ کی شناخت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے۔ سلاسل کی تشکیل وتأسیس نے تصوف کو ایک محکم ومضبوط مقام پر لا کھڑا کیا۔ اور اس طرح یہ تحریک جویندگان جادۂ حق کے لیے زیادہ مفید، معاون اور با مقصد نظر آنے لگی۔ تصوف کی اس منظم صورت نے صوفیا کی قدر ومنزلت میں افزایش پیدا کی اور متشدد وتنگ نظر علماء کے تعدّی وتجاوز پسندی سے اپنے کو مامون ومحفوظ رکھنے کے لیے صوفیوں کو ایک معتبر وسیلہ حاصل ہوا۔

بارہویں صدی عیسوی میں مختلف سلاسل کی بنیاد رکھنے والے مشائخ حضرت علیؓ سے یا حضرت ابوبکرؓ سے اپنی نسبت استوار کرتے تھے۔ بعض شرعی معاملات میں شدید اختلافات کے باوجود تمام سلاسل کے صوفیا کی تاکید وتوجہ آیات کلام اللہ سے متعلق غور وتعمق پر ہوتی تھی۔ بعض سلاسل کے بزرگوں نے نو افلاطونیت، بودھ مت، مسیحیت، یوگ اور ویدانت کے کچھ نکات کو تصوف میں اس طرح ممزوج کر دیا ہے کہ انکی شناخت مشکل ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی کے اواخر تک ایران میں غزوں اور مغلوں کی یورشوں سے ایک قنوطیت کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ صوفیوں کے سلاسل کی

تحریکوں نے وہاں یأس وحرمان کے ماحول کا صبر وثبات کے ساتھ مقابلہ کیا۔صوفیوں کی تحریکیں ایرانی معاشرہ کو بددلی اور مایوسی سے نجات دلاتی رہیں۔ان صوفیوں نے عوام کو نئی راہ دکھائی، اور مذہبی معاملات میں شدت پسندی کو کم کرنے کی کوشش کی اور مذاہب کے درمیان صلح وآشتی کی فضا قائم کی۔اگرچہ کچھ ہی دنوں کے بعد سلاسل کی تحریکیں بے اثر ہونے لگیں۔ان میں زوال وپستی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ذکر وفکر بے معنی ہو گئے۔ اور سماع کی محفلیں تفریح وطرب کا موجب بن گئیں۔اگرچہ سلاسل کی تاریخ میں ایسے بھی موڑ آئے جب صوفیوں نے اس مائل بہ تنزل نظام کے احیا کی کوشش کی۔

سلسلۂ چشتیہ:

چشتیہ سلسلہ کی بنیاد اگرچہ افغانستان کے ایک قصبہ چشت میں پڑی تھی جو ہرات سے سو کلومیٹر مشرق کی جانب واقع ہے۔لیکن اس سلسلہ نے اعتلا وارتقا کے مدارج ہندوستان میں طے کیے۔اس دیار میں جب بتدریج اسلام کا غلبہ ہوا تو یہاں کے معروف ومہم شہروں مثلاً ہرات، چشت اور جام میں صوفیا مختلف مقامات سے کوچ کر کے اقامت گزیں ہو گئے۔نویں صدی عیسوی کے اواخر تک یہ مقامات تصوف کے اہم مراکز بن گئے اور ان شہروں کے صوفیوں کے درمیان تصوف کے ترویجی کار وکوشش میں مسابقت تھی۔ چشت میں منتقل ہونے والے صوفیوں میں شام کے شیخ ابواسحاق شامی بھی تھے۔وہ اپنے جانشین خواجہ ابواحمد ابدال چشتی کو یہاں چھوڑ کر خود شام لوٹ گئے تھے۔ جہاں ۳۲۱ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔خواجہ ابواحمد کے بعد خواجہ ابومحمد اوران کے بعد ان کے خواہرزادہ خواجہ یوسف ایک بلند مرتبت چشتی صوفی تھے جن سے خواجہ عبداللہ انصاری کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ ۴۵۹ھ میں خواجہ یوسف کی وفات کے بعد ان کے فرزند خواجہ مودود چشتی انکے خلیفہ ہوئے۔خواجہ مودود چشتی کی وفات ۵۷۷ھ میں ہوئی۔ خواجہ مودود کے بعد چشت میں چشتیہ صوفیوں کا سلسلہ مائل بہ زوال ہو گیا۔خواجہ مودود کے کچھ مریدین چشت چھوڑ کر مختلف شہر ودیار میں گردش کرنے لگے۔ چشت کی مرکزی حیثیت اوراس کی اہمیت ختم ہو گئی۔

دسویں صدی عیسوی میں غوری ترکوں کی قدرت وقوت میں فزونی پیدا ہوئی اور جب غوری سلطان قطب الدین محمد نے چشت کے نزدیک ایک قلعہ تعمیر کیا تو وہاں کے پرسکون ماحول میں آشفتگی پیدا ہوگئی اور یہ مقام مسائل تصوف کے ارشاد وابلاغ کے لیے موزوں نہیں رہا۔ یہ جگہ شورش پسند وستیزہ جو ترک قبائل کے باہمی جنگ وجدال اور کشت وقتال کا مرکز بن گیا۔ امن وآشتی اس علاقے میں اس وقت لوٹ آئی جب سلطان غیاث الدین کو اقتدار حاصل ہوا۔ جس نے غور پر ۱۱۶۳ء سے ۱۲۰۳ء تک حکومت کی۔ اس کے بھائی معز الدین جو ہندوستان میں آلِ شنسب کی حکومت کا مؤسس تھا اس نے بھی ۱۱۶۳ء سے ۱۲۰۶ء تک حکومت کی۔ اگرچہ غزنہ میں معاشی خوشحالی، تموّل، مکنت و ثروت کا ماحول تھا لیکن یہ شہر صوفیوں کی تحریک کے لیے مناسب نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی جو دورِ وسطیٰ کے صوفیوں میں بلند مقام رکھتے ہیں روحانی کاموں کی تعلیم وتبلیغ کے لیے اس دیار سے کوچ کر کے اجمیر چلے آئے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں عہد ماضی میں لکھے گئے تذکروں اور عصر حاضر کے دانشوروں کی تصنیفوں میں شرح وتفصیل کے ساتھ اطلاعات ملتی ہیں جو ان کے اجمیر میں ورود مسعود کے بعد کے واقعات سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اطلاعات کا فقدان ہے۔ سیر العارفین تالیف جمالی کنبوہ دہلوی میں جیسا کہ مذکور ہے خواجہ معین الدینؒ کا تولد سجستان (سیستان) میں ہوا تھا۔ اوران کی پرورش و آموزش خراسان میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد خواجہ غیاث الدین کی جب وفات ہوئی تھی اس وقت خواجہ معین الدینؒ کی عمر سترہ سال کی تھی۔ خواجہ ایک باغ اور ایک آسیاب کی آمدنی پر جوان کو ارثاً حاصل ہوئے تھے بسر اوقات کرتے تھے۔ باغ میں ایک روز ایک مجذوب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی جن کی تھوڑی دیر کی صحبت وہمنشینی کے زیر اثر ان کا قلب لمعاتِ نور سے مملو ہوگیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد خواجہ نے اپنے گھر کے تمام اثاثہ کو فروخت کر دیا اور اس سے حاصل زر نقد کو فقیروں کے درمیان تقسیم کر دیا۔

بہت دنوں تک وہ سمرقند و بخارا میں علوم دین کی تحصیل میں مشغول رہے۔ وہاں سے خواجہ نے ہروان کا سفر کیا جہاں شیخ عثمان ہروانی کی خدمت میں رہ کر ریاضات شاقہ کرتے رہے۔ شیخ عثمان ہروانی نے انھیں خلافت کی ذمہ داری سپرد کی۔ انھوں نے پھر بغداد کا سفر کیا اور سنجان پہنچ کر نجم الدین کبریٰ سے ملاقات کی۔ اور کچھ دنوں تک ان کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں دو ماہ تک رہے اور پھر بغداد میں شیخ ضیاء الدین، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ شہاب الدین سہروردی کی صحبت و ہمنشینی انھیں حاصل رہی۔ خواجہ بغداد سے پھر ہمدان آئے اور پھر وہاں سے تبریز کا سفر کیا اور اس علاقے میں دو سال تک مقیم رہے۔ وہاں سے استر آباد کے لیے عازم سفر ہوئے۔ پھر وہاں سے ہرات آئے اور ہرات میں گھومتے رہے۔ پھر سبزوار گئے اور اس شہر کے شیعہ حاکم محمد یادگار کو اپنی تبلیغی کوششوں سے اہل سنت کی راہ پر لے آئے۔ وہاں سے بلخ پہنچے اور مولانا ضیاء الدین کو جو صوفیوں کے اقوال کو دیوانوں کی بڑ سمجھتے تھے حلقۂ صوفیا میں داخل کیا۔ وہاں سے غزنہ کے لیے عازم سفر ہوئے اور یہاں سے پھر لاہور پہنچے اور یہاں شیخ علی ہجویری کے مرقد اقدس کے جوار میں اقامت گزیں ہو گئے۔ لاہور سے پھر دہلی آئے اور کچھ دنوں تک یہاں رہنے کے بعد اجمیر روانہ ہو گئے، جہاں وہ فقیرانہ زندگی گزارتے ہوئے ارشاد و ہدایت کے کاموں میں مشغول رہے۔ وہاں ایک درویش ان سے ملاقات کے لیے آیا اور ان سے سوال کیا کہ تارک الدنیا صوفی کون ہوتا ہے، خواجہ نے جواب دیا کہ شریعت کے مطابق وہ جو احکام الٰہی کو پورے طور سے بجالاتا ہے اور ممنوعات سے احتراز کرتا ہے وہ تارک الدنیا ہے۔ لیکن طریقت نے اس کے لیے جو شرطیں رکھی ہیں اُن سب کی پابندی صوفی کے لیے ناگزیر ہے۔ ان میں کچھ اس طرح ہیں۔ صوفی کو کسی سے قرض نہیں مانگنا چاہئے۔ اگر کوئی سات دن کا بھی بھوکا ہو تو بھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی کار نیک انجام دیتا ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کار خیر اس کے پیر کی توجہ اور نظر لطف و کرم کی وجہ سے ممکن ہو سکا جنھوں نے

رسول کریمؐ سے اس کے لیے سفارش کی یا اس کی طرف سے بارگاہ ایزدی میں شفاعت کی۔ اگر وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لیے خود کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔ صوفی کو خاموش رہنا چاہیے اور اس وقت اس کو کلام کرنا چاہیے جب ایسا کرنا اس پر لازم ہو جائے۔ شریعت فضول گوئی کی اجازت نہیں دیتی اور غیر واجب طور سے خاموش رہنے کو بھی ناروا تصور کرتی ہے۔ طریقت کے اصولوں پر چلنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ دن میں سالک طریقت صائم رہے اور ہنگام شب ریاضتوں میں اس کے اوقات گزرے۔

خواجہ معین الدین چشتی کی وفات ۶ رجب ۶۳۳ھ کو اجمیر میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۷ سال تھی۔ ان کی تدفین اسی جگہ انجام دی گئی جہاں انھوں نے زندگی کے زیادہ اوقات گزارے تھے۔ خواجہ حسین ناگوری نے ان کی آرام گاہ کے اوپر مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ پھر مانڈو کے حکمرانوں میں سے کسی نے مقبرہ کے نزدیک خانقاہ کی بنیاد رکھی۔

ہندوستان کے چشتیہ سلسلہ میں خواجہ معین الدین چشتی کے بعد جو مشائخ عظام منصۂ ظہور پر نمودار ہوئے ان میں شیخ حمید الدین ناگوری، خواجہ ضیاء نخشبی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ بدر الدین، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیا، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی اور حضرت گیسو دراز اپنے ظاہری و باطنی محاسن اور لائق تحسین متصوفانہ کارناموں کی بنا پر نہایت شامخ مقام ومرتبہ کے حامل رہے ہیں۔

سلسلۂ قادریہ:

سلسلۂ قادریہ کے مؤسس عبد القادر جیلانیؒ تھے۔ ان کا تولد ۴۷۰ھ میں قریہ جیلان میں ہوا تھا۔ ان کے والد ماجد ابو صالح جنگی دوست بھی ایرانی تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حضرت عبد القادر بغداد چلے گئے جہاں معروف استادوں کی خدمت میں انھوں نے متداول علوم کا اکتساب کیا۔ حضرت جیلانی ابوالخیر حماد کی تحریک وتشویق سے تصوف کی جانب مائل ہوئے۔ پچیس سال تک حضرت عبد القادر یہاں وہاں گھومنے والے درویشوں کی طرح زندگی گزاری۔ پھر گیارہ سال تک وہ گوشۂ انزوا میں رہے۔ وہ

صوفی سے زیادہ عالم دین کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔انھوں نے خانقاہ اور مدرسہ کے اوضاع ومقاصد میں مناسبت وموافقت پیدا کرنے کی سعی کی۔اکاون سال کی عمر میں حضرت متاٗھل ہوئے۔ان کی زندگی کے باقی ماندہ ایام قریہ جل اور شہر بغداد میں گزرے۔حضرت کے ارشادات و ہدایات پر مبنی مجموعے''فتح الربانی'' اور''فتوح الغریب'' دنیائے اسلام میں شہرت رکھتے ہیں۔حضرت عبدالقادر اپنے صوفیانہ افکار کے ابلاغ کے لیے تصوف کی مشکل اصطلاحوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔نہایت سلیس وسہل الفاظ اور دلنشیں طرز میں اپنے مقصد ومدعا کا اظہار کرتے تھے۔حضرت عبدالقادر شیخ ابوسعید کی طرح تیر وکمان اور تیغ وسنان کے وسیلے سے لڑنے والے جہاد سے مجاہدہ بانفس کو زیادہ مہم ومحترم سمجھتے تھے۔ان کے خیال کے مطابق ایک کامل صوفی مسائل زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوتا ہے۔وہ عام انسانوں کی مشکلات کوحل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دنیاوی امور میں مشغولیت کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتا ہے۔ان کے نزدیک احکام شرعیہ کی پابندی روحانی ارتقاء کے حصول کا پہلا مرحلہ ہے اور حقیقت دوسرا مرحلہ ہے۔اس مرحلے میں صوفی اپنے آپ کو تمام مفسد وشر انگیز باتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور ارتکاب گناہ کے لیے باطن میں مخفی خواہشات پر بھی قابو پالیتا ہے۔ اور تیسرا مرحلہ ترک کا ہے جب صوفی تسلیم ورضا کی راہ پر چل کر خوشنودئ خدا کے لیے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیتا ہے۔چوتھا اور آخری مرحلہ فنا کا مرحلہ ہے جہاں صوفی کو حق تعالیٰ کا وصل نصیب ہوجاتا ہے۔

قادریہ سلسلہ کی توسیع واشاعت بہت سے اسلامی ملکوں میں بڑی آہستگی سے ہوئی۔حضرت عبدالقادر کی کرامات اور خارق العادہ کارناموں نے اس سلسلہ کے ارتقاء میں معاونت کی ہے۔لوگوں کا ایسا عقیدہ تھا کہ شیخ جملہ اولیا واقطاب پر فوقیت رکھتے تھے۔ ان کی سرگذشت حیرت انگیز اور فوق العادہ کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔بعض سوانح نگاروں کا یہ خیال ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد نے ان کی روحانی قوت کے

مظاہرات کے زیر اثر دین اسلام کو قبول کرلیا۔ حضرت عبدالقادر کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی۔

ہندوستان میں سلسلۂ قادریہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں قائم ہوا۔ شاہ نعمت اللہ قادری نے اس سلسلہ کو ہندوستان میں قائم کیا، پھر سید محمد غوث گیلانی، مخدوم شیخ عبدالقادر ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس سلسلہ کو عہد مغلیہ میں ترقی کی راہ پر لگایا۔

اس سلسلے کے معروف وممتاز صوفیا عرب وایران کے شہر و دیار کو ترک کر کے اپنی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کی غرض سے مسافرت کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے سرزمین ہند میں وارد ہوئے۔ اور اوائل میں انھوں نے سندھ، پنجاب اور دکن کو اپنے افکار و عقائد کی ترسیل وابلاغ کے مراکز بنائے۔ پھر بتدریج ان کے مشن کا اثر ونفوذ اس ملک کے طول وعرض میں پھیلنے لگا۔ اور آگرہ، دہلی، جونپور، برہانپور، کشمیر، گجرات، بنگال، احمد آباد، دولت آباد اور دوسرے کئی خطّے قادری صوفیوں کے حلقۂ اثر میں آ گئے۔ قادریوں نے اس ملک میں عام لوگوں کے معاشرہ سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ خانقاہوں اور مدرسوں کے توسط سے یہ صوفیا اپنی تعلیمی وتبلیغی مساعی میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ ان کے شیوۂ تبلیغ میں بڑی سادگی ہوتی تھی۔ نہایت دلنشیں انداز میں یہ بزرگان اپنی دعوت کو عوام تک پہنچاتے تھے۔ عرفا کی یہ جماعت اپنے مفہوم ومدعا کی ترسیل کے لیے ملفوظات کے علاوہ مقامی لہجوں میں کہے ہوئے لوک گیت اور قصوں کے وسائل کو بھی استعمال میں لاتی تھی۔ ان صوفیوں کا علمی مرتبہ بہت بلند ہوتا تھا اور اکثر ان میں سے صاحب تصنیف بھی ہوتے تھے لیکن اپنی تصنیفات میں مندرج افکار کو یہ حضرات عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان کی مقامی بولیوں سے بھی استفادہ کرتے تھے۔

مخدوم عبدالقادر شیخ داؤد میاں میر لاہوری اور ملا شاہ بدخشی نے اپنے ملفوظات کے وسیلے سے صوفیانہ افکار کی تبلیغ کی تھی۔ کچھ صوفیوں نے مقامی بولیوں میں شعر گوئی کو تبلیغ وترسیل کا ذریعہ بنایا۔ ان بزرگوں نے اپنے مقصد میں کامیابی کے حصول کے لیے عوام کے مزاج ومذاق، خصائل وطبائع، امیال واحساسات کا غور وتوجہ سے مطالعہ کیا تھا

اور عامۃ الناس کے محیط وماحول سے بخوبی آشنائی پیدا کرلی تھی۔ جس کے نتیجے میں انھیں اپنی تحریکوں میں کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ حضرات ہندوؤں کے اصول دین اور فکر وفلسفہ سے بھی بوجہ احسن واقف ہوتے تھے۔ ان کے بعض شیوہ ہای عبادت وریاضت مثلاً حبس دم اور تفکر ومراقبہ کو اپنے طریقۂ ریاضت میں شامل کرلیا تھا۔ ایسی تدبیروں کو عمل میں لانے سے صوفیان قادری برصغیر میں بہت مقبول ہوئے۔

پندرہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ملتان کے مضافات میں واقع قصبہ اوچ میں ایک قادریہ خانقاہ کی تاسیس ہوئی۔ اس کے بنیا نگذار شیخ محمد الحسینی تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اخلاف میں سے تھے۔ ان کا وطن ترکستان تھا۔ انھوں نے خراسان، ملتان اور اوچ کی مسافرت کی اور آخرالامر وہ اوچ میں سکونت پذیر ہوگئے۔

شیخ محمد الحسینی ایک معروف صوفی ہونے کے باوصف ایک معتبر شاعر بھی تھے۔ قادری تخلص کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق نے اپنے تذکرہ 'اخبار الاخیار میں ان کے کچھ اشعار کو نقل کیا ہے۔ شیخ محمد کے بعد ان کے بڑے بیٹے شیخ عبدالقادر ثانی اوچ میں سلسلۂ قادریہ کے پیشوا ہوئے۔ جوانی کے ایام میں عبدالقادر ثانی کو موسیقی اور مسافرت کا بہت زیادہ شوق تھا۔ لیکن جب وہ کہولت کی عمر کو پہنچے تو ان کے اندر تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ درویش ہوگئے، دنیا اور تمایلات دنیوی سے کنارہ کش ہوگئے اور سلطان کی جانب سے عطا کیے ہوئے فرامین اور جاگیریں انھوں نے لوٹا دیئے۔ شیخ عبدالحق نے اپنے تذکرے میں شیخ عبدالقادر ثانی سے منسوب بہت سی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۵۳۳ء میں ان کے بڑے فرزند شیخ عبدالرزاق ان کے جانشین ہوئے۔ لیکن ایک مختصر مدت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ شیخ حامد نے ان کی جگہ لی جن کی تربیت ان کے دادا شیخ عبدالقادر ثانی کے سایۂ عاطفت میں ہوئی تھی۔ اکبر کی حکومت کے اوایل میں صدر الصدور شیخ گدائی کنبوہ نے انھیں اوچ سے کنبوہ بلالیا۔ شیخ حامد شیخ گدائی کی جانب سے صادر کیے گئے احضار نامہ سے بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ اس کے سبب انھوں نے شیخ گدائی اور ان کے سرپرست بیرم خاں کے حق میں بددعا کی تھی۔ جس کے نتیجے میں ۱۵۶۰ء میں بیرم خاں

اقتدار سے جدا کر دیئے گئے تھے اور شیخ گدائی بھی ذلیل وخوار ہوئے تھے۔ ملتان واپس ہو کر شیخ حامد اپریل ۱۵۷۱ء میں فوت ہو گئے۔

شیخ حامد کے دو فرزند شیخ عبد القادر اور شیخ موسیٰ تھے۔ اوچ میں شیخ عبد القادر، شیخ حامد کے جانشین سمجھے جاتے تھے۔ جب کہ دہلی میں شیخ موسیٰ کو یہ اعزاز حاصل تھا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی بھی جو شیخ موسیٰ کے عقیدت مند تھے، ان کو شیخ حامد کا جانشین سمجھتے تھے۔ شیخ حامد کے جملہ ارادت مندوں میں اہم ترین شیخ داؤد تھے۔ ان کے آبا واجداد عرب تھے۔ ان کا تولد ملتان کے نواح میں واقع قریہ ست پور میں ہوا تھا۔ شیخ داؤد نے اوچ، ملتان اور لاہور کے ممتاز علما کی خدمت میں تعلیم مکمل کی۔ تصوف سے بہت زیادہ وابستہ تھے چنانچہ بیشتر اوقات وہ عالم جذب وجنوں میں رہتے تھے۔ اور اجودھان (پاک پٹن) کے بیابانوں میں گھومتے رہتے تھے اور شیر گڑھ سے قریب غیر آباد علاقوں میں ان کے اوقات گزرتے تھے۔ بیس سال تک وہ اسی طرح گشت کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ حضرت غوث اعظم انھیں ہدایت فرما رہے ہیں کہ وہ شیخ حامد کے ارادت مندوں کے حلقہ میں داخل ہو جائیں اور اب خانقاہ کی زندگی اختیار کریں۔

شیخ داؤد نے ہندوؤں کی ایک معتنا بہ تعداد کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ ان کے کرامات سے مغلوب ومتاثر ہو کر ہنود حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے۔ شیخ داؤد کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی اور وہ شیر گڑھ میں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کی شخصیت کے سبب سلسلۂ قادریہ پنجاب، دہلی اور آگرہ میں فروغ وارتقاء کی راہ پر بڑی سرعت سے چلنے لگا۔ شیخ عبد المعالی (تولد ۹۶۱ھ) شیخ داؤد کے جانشین ہوئے جو ان کے عم زاد اور داماد تھے۔ شیخ عبد المعالی شعر وادب کا بھی ذوق رکھتے تھے اور شعر گوئی میں غربتی تخلص کرتے تھے۔ ان کی وفات ۱۶ر ربیع الاول ۱۰۲۴ھ کو ہوئی اور تدفین وتکفین کا کام لاہور میں انجام پایا۔ ان کے مریدوں میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی تھے۔ ان کے علاوہ شیخ ابو اسحاق قادری

بھی ان کے ارادت مندوں میں تھے۔ ابواسحاق قادری کے معروف مریدوں میں شاہ شمس الدین قادری لاہوری تھے۔ بادشاہ جہانگیر کوان کی روحانی حیثیت ومرتبت پر بڑا یقین تھا۔ پنجاب کے دوسرے قادری صوفیا میں سید اسماعیل گیلانی کا اسم گرامی لائق ذکر ہے۔ ان کے علاوہ شیخ بہلول دریا متوفی ۹۸۳ھ اوران کے مرید شیخ حسین لاہوری کے جد اعلیٰ کلاس رای سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ لاہور کے جنگلوں میں بیس سال تک گھومتے رہے اوراوقات شب وہ حضرت ہجویری کے مرقد کے نزدیک گزارتے تھے۔ پنجاب میں سلسلۂ قادریہ کی ایک شاخ نے شیخ عبدالقادر ثانی کے پوتے سید محمد غوث بالا پیر متوفی ۹۵۸ھ کی کوششوں سے فروغ وپیش رفت کے مراحل طے کیے۔

شاہ معروف قادری بھی ایک محترم وبااثر صوفی تھے۔ وہ بابا فرید کے اخلاف میں سے تھے۔ شاہ معروف کے جانشین شاہ سلیمان لاہور کے جوار میں واقع قریہ بھیلووال کے ایک روستائی کے فرزند تھے۔ شاہ سلیمان کے نہایت معروف ونامور خلیفہ حاجی محمد قادری تھے۔ جونوشاہ گنج بخش کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ ان کی وفات ۱۰۶۴ھ میں ہوئی۔ ان کے اعقاب نوشاہیر کہلاتے تھے۔ پنجاب کے کھوکھر قبیلہ سے ان کا تعلق تھا۔ سترہ سال کی عمر میں نوشاہ نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور بیابانوں میں رہنے لگے تھے۔ اوردریائے راوی کے ساحل پر ذکر وفکر میں مشغول رہتے تھے۔

اوچ ولاہور صوفیای قادری کی تبلیغی مساعی کے لیے بنیادی محل ومکان تھے۔ پھراس سلسلہ کی شاخیں کشمیر میں قائم ہوئیں۔ کشمیر میں اوائل دور کے بنیا نگذاروں میں شیخ احمد قادری تھے جو شیخ بہاء الدین زکریا کے اخلاف میں سے تھے۔ شیخ احمد نے طویل مسافرتیں کی تھیں اورآخر کار لاہور میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ اور یہاں شیخ محمد کے دست پُر میمنت پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ بعد کو داؤد خاکی کی دعوت پر وہ کشمیر چلے گئے۔ ان کی وفات سرینگر میں ہوئی۔

بابا داؤد بھی آخر کار شیخ احمد کے تحت تأثیر سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ بابا داؤد کے مرید میر نازک جو سہروردیہ اور قادریہ دونوں سلسلوں سے وابستہ تھے۔ وہ اپنے صوفیانہ اطوار واصول کی پابندی میں بہت سخت تھے، سماع کے مخالف تھے۔ ۱۰۲۲ھ میں میر نازک کا انتقال ہوگیا۔ ان کی رحلت کے بعد خانقاہ کی ذمہ داری میر نازک کے چھوٹے فرزند میر محمد علی قادری کے سپرد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داراشکوہ کے پیر ملا شاہ کا اثر ونفوذ کشمیر میں بہت زیادہ تھا۔ ملا شاہ اکثر گرمیوں میں کشمیر میں رہتے تھے۔ میر محمد قادری کی تبلیغی کوششوں سے کشمیر میں ملا شاہ کے اثر ورسوخ میں کمی آئی تھی۔

مغل بادشاہ شاہ جہاں کے زمانے میں شاہ نعمت اللہ قادری پنجاب سے کشمیر چلے آئے تھے۔ یہاں انھوں نے حاجی بابا قادری کو اپنے سلسلہ میں داخل کیا تھا۔

گجرات میں سلسلۂ قادریہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے ایک خلف سید جمال پتھری کے ذریعہ متعارف ہوا۔ ان کے والد سید حسین ایران سے کوچ کر کے دکن چلے آئے تھے اور احمد نگر کے نزدیک قصبہ پتھری میں سکونت پذیر ہوگئے۔ سولہویں صدی میں گجرات میں ایک معروف قادریہ صوفی میر عبدالصمد خدانما تھے۔ رہنمائی ورہبری کی غیر معمولی لیاقت کی بنا پر وہ خدانما کے لقب سے مشہور تھے۔ مانڈو میں مقیم ہونے والے قادریہ صوفی شیخ بہاءالدین تھے جو اساساً شطاریہ تھے۔ بعد میں قادریہ سلسلہ سے وابستہ ہوئے۔

دہلی وآگرہ کے علاقوں میں سلطان سکندر لودی کے ایام حکومت میں قادریہ سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ سلطان نے شیخ ابوالفتح بن جمال الدین مکی عباسی قادری کو آگرہ میں سکونت پذیر ہونے کے لیے شروان سے بلایا تھا۔ اس زمانے میں ایک معروف صوفی جو غوث الاعظمؒ کے اعقاب میں سے تھے بغداد کے شیخ عبداللہ فرزند سید عمر تھے۔ انھوں نے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنے ارادت مندوں کے حلقے میں داخل کیا۔ شیخ عبداللہ کی وفات ۱۰۳۷ھ میں ہوئی۔

شیخ محمد حسن ایک دوسرے بزرگ تھے جو اوّلاً چشتیہ سلسلے سے وابستہ تھے لیکن

بعد کو وہ یمن میں سلسلۂ قادریہ سے منسلک ہوگئے۔ عربستان سے لوٹنے کے بعد وہ آگرہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ عبدالحق محدث دہلوی شیخ محمد حسن کی روحانی عظمت وشائستگی کی ستایش کرتے ہیں۔ موصوف وحدت الوجودی صوفی تھے۔ ۲۷/رجب ۹۴۴ھ کو شیخ محمد حسن واصل بہ حق ہوگئے۔ شیخ عبدالحق کے ایک عم موسوم بہ شیخ فضل اللہ شیخ محمد حسن کے مریدوں میں سے تھے۔ ان کے تمام مریدوں میں سب سے زیادہ معروف ومعتبر شیخ عبدالرزاق تھے۔ وہ ابن عربی کے عرفانی افکار کے بالیاقت شارح تھے۔ ایک دوسرے اہم قادری صوفی جن کا تعلق دہلی سے تھا، میر سید عبدالاوّل بن علی الدین حسینی تھے۔ ان کے بزرگوں کا تعلق زید پور من مضافات جونپور سے تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ خانوادہ دولت آباد منتقل ہوگیا۔ سید عبدالاوّل کا تولد دولت آباد ہی میں ہوا تھا۔ تحصیل تعلیم کا دور بھی انھوں نے اسی شہر میں مکمل کیا اور اوائل تک گجرات میں رہے، اس کے بعد انھوں نے مکہ کی مسافرت کی۔ مکہ یا مدینہ میں وہ قادریہ سلسلہ سے متعلق ہوئے۔ احمد آباد واپس ہونے کے بعد بیرم خاں کی دعوت پر دہلی چلے آئے۔ یہاں ان کا انتقال ۹۶۸ھ میں ہوگیا۔ سید عبدالاوّل بہت ساری کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں اہم ترین ''فیض الباری'' ہے جو صحیح بخاری کی شرح ہے۔ روح کے موضوع پر ان کی تصنیف موسوم بہ ''معرفتِ نفس'' بھی بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ تصوف کے موضوع پر ایک کتاب بنام سیر والسلوک ہے جو ''فتوحات مکیہ'' کی شرح ہے۔

سلسلۂ قادریہ کے صوفیوں میں وحدت الوجودی افکار کے بہت بڑے شارح شیخ امان اللہ پانی پتی تھے۔ کچھ دوسرے سلاسل سے بھی ان کا رشتہ تھا لیکن قادری سلسلہ سے ان کی وابستگی زیادہ استوار تھی۔ وہ شیخ محمد مودود لاری کے مریدوں میں سے تھے۔ وہ تصوف کے کئی رسالوں کے مصنف بھی تھے۔ شیخ امان اللہ اگرچہ زیادہ لوگوں کو مرید نہیں بناتے تھے پھر بھی ان کے ارادت مندوں کی تعداد قابل لحاظ تھی۔ شیخ امان اللہ پانی پتی کے ارادت مندوں میں شیخ سیف الدین بھی تھے جو شیخ محدث دہلوی کے پدر محترم تھے۔

اوائل میں شیخ سیف الدین سہروردیہ سلسلہ سے وابستہ تھے لیکن بعد کو وہ شیخ امان اللہ کے دست فیض بخش پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔

شیخ سیف الدین فقیہوں کے اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ 'سماع' مکر و ریا کاری کا موجب ومحرک ہوتا ہے۔ وہ اپنے خیال کی حمایت میں یہ توجیہ پیش کرتے تھے کہ مجلس سماع میں شریک ہونے والا مطرب کی آوازہ خوانی سے مغلوب ہوکر اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے، اسے عالم شورومستی میں اپنے وجود کا بھی احساس باقی نہیں رہتا ہے تو وہ مکار وریاکار کس طرح ہوسکتا ہے۔ شیخ سیف الدین شاعر بھی تھے اور سیفی تخلص کرتے تھے لیکن ان کے اشعار اب ناپید ہوچکے ہیں۔ اگرچہ ان کے لائق فرزند شیخ عبدالحق نے اپنے تذکرے میں ایک قصیدہ جو شیخ امان پانی پتی کی ستائش میں ہے شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ متصوفانہ طرز میں کہی ہوئی دو غزلیں بھی مندرج ہیں۔

انھوں نے سلسلۃ الوصال نام کی ایک مثنوی بھی لکھی تھی، لیکن ان کی تخلیقات میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں ہے، بجز رسالہ 'کاشفات' کے جس کا کچھ حصہ 'اخبار الاخیار' میں شامل ہے۔

ان کے فرزند ارجمند شیخ عبدالحق کا تولد ۹۵۸ھ میں ہوا تھا۔ شیخ سیف الدین نے ان کی طبیعت میں تصوف کا ذوق پیدا کیا اور سلسلۂ قادریہ کی جانب ان کے ذہن کو منعطف کیا۔ اور شیخ موسیٰ کے ارادت مندوں میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ شیخ عبدالحق کچھ دنوں تک مالوہ، گجرات اور احمد آباد کی سیاحت کی۔ احمد آباد میں اقامت گزیں بھی رہے۔ وہاں ان کی ملاقات وجیہ الدین شطاری سے ہوئی تھی۔ اور مانڈو میں وہ شیخ غوثی شطاری (مصنف گلزار ابرار) کے مہمان رہے۔ اور اوجین میں عبدالحق مالوہ کے والی میرزا عزیز کوکہ کی اقامت گاہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ جب وہ احمد آباد پہنچے تھے، اس وقت موسم بحری سفر کے لیے نامساعد تھا۔ چنانچہ انھیں مکہ کے سفر سے پہلے احمد آباد میں شیخ نظام الدین احمد بخشی کے گھر پر کچھ دنوں تک رکنا پڑا۔

جب بحری سفر کے لیے موسم موافق ہوا تو ان کے میزبان نے عربستان کی مسافرت کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ ۹۹۶ھ میں ماہ رمضان سے کچھ پہلے شیخ عبدالحق مکہ پہنچے۔ وہاں کی اقامت کے دوران شیخ عبدالحق شیخ عبدالوہاب متقی القادری الشاذلی کے حضور میں صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے دروس کو اختتام تک پہنچایا اور علم حدیث میں کامل استعداد حاصل کی۔ شیخ عبدالوہاب متقی نے انھیں چشتیہ، قادریہ اور شاذلیہ سلاسل سے منسلک کیا اور ساتھ ہی مختلف سلاسل تصوف کے نزاعی واختلافی مسائل میں جادۂ اعتدال پر قائم رہنے کی ہدایت کی۔ آخرکار شیخ عبدالحق نے مکہ کی سرزمین مقدس کو شوال ۹۹۹ھ میں سفر مراجعت کے لیے چھوڑ دیا اور ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان پہنچے۔ دہلی پہنچنے کے بعد وہ خواجہ باقی باللہ سے قریب ہوئے۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء میں بادشاہ اکبر کی وفات کے بعد شیخ عبدالحق کو یہ امید تھی کہ اعیان سلطنت اکبر کے صلح کل کے اصول کی جگہ پر احکام شریعت کو پھر سے نافذ کر دیں گے۔ اس ضروری امر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انھوں نے مرتضیٰ خاں کے نام ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ انھیں امور سلطنت کی تعمیل میں جادۂ شریعت سے کسی قیمت پر منحرف نہیں ہونا چاہئے۔ شیخ عبدالحق کی وفات ۲۱؍ربیع الاول ۱۰۵۴ھ کو ہوئی اور وہ حوض شمسی میں مدفون ہوئے۔

شیخ عبدالحق بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات کی تعداد ایک سو کے قریب ہے۔ لیکن وہ علم حدیث میں زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی جملہ تصانیف میں مشکواۃ المصابیح کی فارسی تفسیر بعنوان 'اشعۃ اللمعات' زیادہ اہم ہے۔ شیخ عبدالحق نے صراط مستقیم مصنفہ مجدالدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی کی فارسی تفسیر بھی لکھی تھی۔ ان کی کتاب اخبارالاخیار ہندی صوفیوں کا تذکرہ ہے۔ شیخ عبدالحق نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اہم تصنیف 'فتوح الغیب' جو ان کے اٹھہتر نصائح پر مشتمل ہے کا فارسی ترجمہ اپنے استاد شیخ عبدالوہاب متقی کی ہدایت پر کیا اور اس کا نام 'مفتاح الفتوح' رکھا۔ شیخ عبدالحق کی تعلیمات کی بنیاد حضرت غوث الاعظم کا وہ نظریہ تھا کہ وہ جملہ چیزیں جن کو شریعت مسترد کرتی

ہے ارتداد ہے۔ وہ مجاہدہ، ریاضت اور شریعت کی پابندی کو خدا کی طاعت کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اور اس نظریہ کے سخت مخالف تھے کہ شریعت کی پابندی عام لوگوں کے لیے ضروری ہے، خدارسیدہ فقراء کے لیے لازم نہیں ہے۔ وہ احمد بن ابراہیم الواسطی جو عرب کے ایک درویش تھے کی تصنیف کردہ کتاب ''فقر المحمدی'' کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

شیخ عبدالحق کے تین فرزندوں میں سب سے زیادہ لائق بڑے فرزند شیخ نورالحق تھے جو ان کے جانشین ہوئے۔ شیخ عبدالحق کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جن کا تعلق جونپور، بنارس اور بہار سے تھا۔

قادریہ سلسلہ کے ایک صوفی میاں میر بھی تھے۔ ان کے اسلاف کا تعلق سندھ سے تھا۔ ان کی والدہ بھی متصوفانہ میلان رکھتی تھیں۔ میاں میر کی پیدائش ۹۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ جوانی کے ایام میں وہ بیابانوں میں ریاضت کش ہونے لگے۔ نوجوانی کے عالم میں ہی وہ سلسلۂ قادریہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ وحدت الوجودی صوفی تھے۔ ان کی وفات ۷/ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو ہوئی۔ ان کے مریدوں میں حاجی نعمت اللہ سرہندی تھے۔ ان کے علاوہ ملا ابراہیم رومی، ملا خواجہ کلاں، ملا عبدالغفور، حاجی صالح کشمیری اور ملا خواجہ بہاری بھی ان کے حلقۂ مریدان میں شامل تھے۔ ملا خواجہ بہاری کا تعلق حاجی پور بہار سے تھا۔

میاں میر کے اہم مریدوں میں ملا شاہ بھی تھے جو داراشکوہ کے پیر تھے۔ دارا شکوہ کی بہن جہان آرا، بھی ملا شاہ کی ارادت مند تھی۔ داراشکوہ کو ملا شاہ کی ارادت مندی کے حصول میں محنت کرنی پڑی تھی۔ شروع میں ملا شاہ ان کو اپنا مرید نہیں بنانا چاہتے تھے۔ بعد کو ملا شاہ کے کچھ عزیز مریدوں کی معاونت سے داراشکوہ ان کے ارادت مندوں کے دائرے میں شامل ہوسکے۔

میاں میر کو ملا شاہ پر بڑا فخر تھا۔ انھوں نے پیش گوئی کی تھی کہ سلسلۂ قادریہ ملا شاہ کے ذریعہ فروغ پائے گا۔

داراشکوہ ملا شاہ کے راسخ معتقد تھے۔ انکی روحانی قوت پر داراشکوہ کو کامل یقین تھا۔ ان کے روحانی اثرات سے بہت سے ہندو سرینگر میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ۱۶۵۸ھ میں جب داراشکوہ کو اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اس کے حامیوں کے تئیں اورنگ زیب کے رویہ میں شدت وسختی پیدا ہوگئی تھی اور ملا شاہ اس زمرے میں سرفہرست تھے۔ اورنگ زیب ملا شاہ کے وحدت الوجودی تصور سے رنجیدہ تھے۔ ملا شاہ سے داراشکوہ کی ارادت وعقیدت کا رشتہ بنیاد پرست علما کی رنجش و ناپسندیدگی کا موجب ہوا۔

داراشکوہ کی قادریہ سلسلہ میں دلچسپی کے محرک شیخ میرک تھے۔ پھر بعد میں میاں میر کی صحبتوں سے اس میلان میں فزونی پیدا ہوئی۔ میاں میر سے داراشکوہ کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب شاہ جہاں نے اس کی کچھ بیماریوں میں شفا کے لیے اسے ان کی دعاؤں کے لیے ان کے حضور میں بھیجا تھا اور ان کی دعاؤں کی برکت سے داراشکوہ صحت یاب ہو گئے تھے۔

داراشکوہ تصوف سے متعلق چند کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ مثلاً سفینۃ الاولیاء۔ یہ داراشکوہ کی بہت اہم تصنیف ہے۔ اس رسالے کو ۱۰۴۹ھ پچیس سال کی عمر میں مکمل کیا۔ یہ کتاب ۴۱۱/اسلامی مشائخ کے احوال وآثار پر محتوی ہے۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ سب سے پہلے ۱۲۶۹ھ میں آگرہ میں چھپی، پھر ۱۸۷۲ء میں لکھنؤ میں چھپی۔ اردو زبان میں اس کتاب کے ترجمے ہوئے ہیں۔

سکینۃ الاولیاء داراشکوہ کی دوسری تصنیف ہے۔ اٹھائیس برس کی عمر میں اس نے ۱۰۵۲ھ میں اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کتاب میں میانجیو کے مناقب و محاسن کا ذکر ہے۔ علاوہ براین اس میں ان کے مریدوں اور خلیفوں کے بھی احوال بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر تاراچند سابق سفیر ہند در ایران اور استاد جلال نائنی کی مساعی سے ایران میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ داراشکوہ کی تیسری تصنیف 'رسالۂ

حق نما' ہے۔ یہ کتاب جادۂ طریقت کے نو واردوں کے استفادہ کے لیے لکھی گئی تھی۔ حسنات العارفین داراشکوہ کی چوتھی تصنیف ہے جس کی تکمیل ۱۰۶۴ھ میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب صوفیانہ عقاید کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کچھ صوفیانہ افکار ایسے ہیں جو اسلامی عقاید سے مناسبت نہیں رکھتے۔

مجمع البحرین داراشکوہ کی پانچویں تصنیف ہے۔ ۱۰۶۵ء میں اس کی تصنیف مکمل ہوئی تھی۔ اس کتاب کے ذریعہ داراشکوہ نے ہندو دھرم اور اسلام کو قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے نتیجے میں داراشکوہ علماء اسلام کی نظر میں معتوب و مردود قرار دیئے گئے تھے۔ اس کتاب کے مطالب کو علماء نے ارتداد پر محمول کیا۔ یہ کتاب بھی ایران سے چھپ چکی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ داراشکوہ کے دائرہ تصنیفات میں سرِ اکبر بھی شامل ہے جو اوپنشاد کے پچاس اقوال زریں پر محتوی ہے۔ داراشکوہ نے برہمن پنڈتوں کی مدد سے اس کتاب کو ۱۰۶۷ھ میں مرتب کیا تھا۔

سولہویں صدی میں بنگال میں ایک قادریہ مرکز قائم ہوا۔ اس کے بناء ڈالنے والے سید ابوالحیات کے فرزند شاہ قامص تھے۔ دیوان عبدالرشید جونپور کے مریدوں نے بھی بنگال میں قادریہ سلسلہ کا مرکز قائم کیا تھا۔ سترھویں صدی میں بنگال کے معروف قادری صوفی میر سید محمد قادری راج محل کے باشندہ تھے۔ جن کے جانشین شاہ نعمت اللہ ہوئے جو نارنول کے رہنے والے تھے۔ وہ بنگال چلے گئے تھے۔ شاہ شجاع، اور چند مغل اعیان و اشراف شاہ نعمت اللہ کے مرید ہوگئے تھے۔ راج محل کے نزدیک فیروز پور میں شاہ نعمت اللہ نے اپنی خانقاہ بنوائی تھی۔ شاہ نعمت اللہ کی وفات ۱۰۷۷ھ میں ہوئی تھی۔ ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جنھوں نے بنگال میں سلسلۂ قادریہ کی ترقی و توسیع میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ سترہویں صدی عیسوی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں قادریہ سلسلہ کو لکھنؤ کے علاقے میں بڑی کامیابی ملی۔ یہ کامیابی بانسا کے شاہ عبدالرزاق کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ شاہ عبدالرزاق کے مریدوں

میں ملا نظام الدین محمد سیہالوی تھے جو ملا قطب الدین سیہالوی کے فرزند تھے۔انھوں نے اپنے پیر شاہ عبدالرزاق کی زندگی کی سرگذشت بعنوان ''مناقب الخذآقیہ'' تالیف کی تھی۔

سترہویں صدی میں سلسلۂ قادریہ مظفر نگر اوراس کے جوار میں مقبول ہونے لگا۔ اور میر سید طٰہٰ قطب الدین قادری کی کوششوں سے یہ سلسلہ انبالہ میں بہت متعارف ہوا۔

سلسلۂ سہروردیہ:

سہروردیہ سلسلہ کے بنیان گذار شیخ شہاب الدین ابوحفص سہروردی تھے۔ یہ سلسلہ اسلامی دنیا کے بیشتر حصوں میں بڑی سرعت سے ترقی وتوسعہ کی منزلیں طے کرنے لگا۔ شیخ شہاب الدین رجب ۵۳۹ھ میں متولد ہوئے۔ انھوں نے مذہبیات کی تعلیم شیخ عبدالقادر سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے معروف علمائے دین سے بھی اکتساب فیض کیا۔ ایاّم جوانی میں شیخ شہاب الدین سہروردی کو بغداد کے حنبلی عالم دین عبدالرحمٰن ابن جوزی کی مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خلفائے بغداد علامہ جوزی کے علمی مرتبہ کا احترام کرتے تھے۔ وہ ایک کثیر التصانیف عالم تھے۔انھوں نے شیخ عبدالقادر جیلانی پر بھی فلسفہ وارتداد کی تبلیغ وترویج کا الزام لگایا۔انھوں نے اپنی تصنیفوں میں نہ صرف غیر سنی فرقوں کی مذمت کی ہے بلکہ سنی فقیہوں، محدثوں اور صوفیوں کی ایک بڑی تعداد کو ہدفِ ملامت قرار دیا ہے جن میں ابوطالب مکّی، امام قشیری اور غزالی شامل ہیں۔

لیکن خلیفہ الناصر نے ابن جوزی کی کورانہ حمایت وحوصلہ افزائی کے طریق کار کو بدل ڈالا اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی معتدل ومتوازن روش درخور توجہ سمجھی جانے لگی۔ خلیفہ نے انھیں سفیر بنا کر مختلف اسلامی ملکوں مثلاً مصر وتونیہ وغیرہ بھیجا تھا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں ''عوارف المعارف'' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں تصوف اور عقائد کی انتہا پسندی کے مابین مصالحت وموافقت کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تصوف کے بنیادی نکات کو

بڑے جامع طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ نے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ جس نے اس کتاب کو نہیں پڑھا وہ صوفی نہیں ہوسکتا۔ ''مناقب الاصفیا'' میں حضرت شعیب ؒتحریر فرماتے ہیں:

> ''شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی چون عوارف را تصنیف کرد گفت برخواجم عرض کنید یعنی برخواجہ نجم الدین عرض کنید اگر او قبول کند بدارند وگرنہ بشویند خواجہ نجم الدین چون عوارف را دید گفت صوفی را از این چارہ نیست۔ ہر صوفی کہ این کتاب مخدوم زادہ نداند صوفی نباشد۔''

تیرہویں صدی میں جب سلاسل وجود میں آنے لگے تو سہروردیہ سلسلہ کے علاوہ چشتیہ اور قادریہ سلاسل کے بزرگان اپنے مریدوں کو عوارف کے مطالعہ کی تاکید کرتے تھے۔ عزالدین محمد بن علی کاشانی متوفی ۷۳۵ھ نے ایک کتاب بعنوان مصباح الہدایہ ومفتاح الکفایہ' عوارف المعارف کی بنیاد پر فارسی زبان میں تھوڑے ترمیم واضافہ کے ساتھ لکھی تھی۔

اس کتاب میں شیخ شہاب الدین قواعد کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ لفظ صوفی کا تعلق صفہ سے ہے۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسجد نبوی کے چبوترے پر رہنے والے رسول کے صحابیوں اور اس دور کے بعد ظہور میں آنے والے صوفیوں کی روش زندگی میں بہت مماثلت تھی۔ ان کے خیال کے مطابق لفظ صوفی کا اشتقاق 'صوف' سے ہوا ہے کی رسول کریم نے بھی تائید کی ہے۔ دوسرے مشائخ کی طرح شیخ شہاب الدین ایسے لوگوں کو گمراہ تصور کرتے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ روحانی معرفت کے حصول نے انھیں احکام شریعت کی پیروی سے آزاد کردیا ہے۔ اسی طرح شیخ ایسے صوفیوں کو موردنکوہش قرار دیتے ہیں جو حضرت عیسیٰ مسیح کی شخصیت کے روحانی اور مادّی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے حلول کے نظریہ کے طرفدار تھے۔ قرآنی آیات کی

بنیاد پر شہاب الدین سہروردی کہتے ہیں کہ علم ظاہر نہیں بلکہ معرفت باطنی تصوف کی بنیاد ہے۔ اوراس باطنی علم کی دریافت مدرسہ میں ممکن نہیں ۔ یہ تو پیغمبروں کی میراث ہے۔ موہبت ایزدی ہے۔ حق تعالیٰ کے لطف وکرم پر اس کا انحصار ہے۔

شیخ شہاب الدین فرماتے ہیں کہ صوفیا کے دو طبقے ہیں۔ اول طبقہ میں وہ صوفیا ہیں جن کی روحانی بصیرت ان کے باطنی فہم وادراک کے مطابق ہے۔ اور دوسرے طبقہ میں وہ صوفیا ہیں جنھیں فوق العادہ اشراق وانوار مجاہدہ نفس اور تکبر وخود بینی کے احساسات کو مغلوب کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ متصل مجاہدہ سے اپنے نفسانی تمایلات پر کامل طور پر اختیار حاصل کر لیتے ہیں۔ خانقاہوں کے قیام کو شیخ بدعت تصور کرتے تھے لیکن اس کی افادیت کا اعتراف کرتے تھے اور اہل خانقاہ کے اطوار وخصائل میں اصحاب صفہ کے علائم دیکھتے تھے۔

حال ومقام تصوف کی دو اصطلاحیں ہیں۔ شیخ شہاب الدین کہتے ہیں کہ ان دونوں کے تمیز وتشخیص میں اشتباہ نہیں ہونا چاہئے - حال ایک تبدل پذیر نفسیاتی کیفیت ہے لیکن مقام نسبتاً دیرپا ہے۔ مثال کے طور پر طریقت کا مبتدی سالک ذکر وفکر کے ایک خاص رویہ کو اختیار کرتا ہے جو اس کے صوفیانہ سفر کا دائمی اختصاص نہیں ہوتا بلکہ اس کی فکری روش کی ایک تحول پذیر صورت کا نشان دہ ہوتا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کے تفکر وانہماک میں جب ثبات وپائداری کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے تو مبتدی دوسرے مقام میں پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر تیسرے مقام یعنی مقام مشاہدہ میں اس کا ورود ہوتا ہے جب وہ عالم لاہوت کے اسرار کو سمجھنے لگتا ہے۔ توفیق وتائید ایزدی اور اپنی ذاتی مشقت وکاوش سے ہی صوفی اس مقام کو دریافت کرتا ہے۔

ایران وماوراء النہر کے اطراف وجوانب سے شیخ شہاب الدین سہروردی کے بہت سے خلفا وارادت مندان ہدایت وارشاد کے مقصد سے ہندوستان آئے۔ لیکن ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کی بنا رکھنے والے دراصل بہاء الدین ذکریا اور شیخ جلال الدین

تبریزی تھے۔ شیخ بہاء الدین ذکریا کے آبا واجداد محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ سندھ آئے تھے۔ بہاء الدین کا تولد ملتان کے جوار میں واقع کوٹ کرور میں ۵۷۹ھ میں ہوا تھا۔ قرآن کو حفظ کر لینے کے بعد وہ مزید تعلیمات کی تحصیل کے لیے خراسان چلے گئے جہاں وہ سات سال تک مقیم رہے اور پھر وہاں سے بخارا کے لیے روانہ ہوئے۔ اور پھر فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد وہ مدینہ تشریف لے گئے۔ جہاں پانچ سال مقیم رہ کر انھوں نے مولانا کمال الدین محمود سے علم حدیث سیکھا۔ وہاں سے پھر بیت المقدس ہوتے ہوئے بغداد آئے۔ یہاں شیخ شہاب الدین سہروردی نے انھیں اس سلسلہ سے وابستہ کر کے خلافت واجازت سے مشرف کیا اور صرف سترہ دنوں میں ان کی متصوفانہ تعلیم وتربیت مکمل ہوگئی۔ شیخ کے دوسرے ارادت مندوں کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ ایک ہندی فقط سترہ دنوں میں تعلیم تصوف کے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا جب کہ دوسرے طالبان حق وصداقت برسوں سے اس مقصد کے حصول میں کوشاں ہیں۔

حضرت بہاء الدین بغداد سے نیشا پور ہوتے ہوئے ملتان پہنچے، لیکن وہاں کے مشائخ کے لیے حضرت بہاء الدین کا ورود تشویش وتردد کا موجب ہوا۔ انھیں حضرت بہاء الدین کی عظمت وشہرت کے سبب اپنی حیثیت ومرتبت میں کاہش کا خوف تھا۔ اور مخصوصاً علماء کا طبقہ وہاں ان کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ حضرت بہاء الدین ذکریا اور وہاں کے مولانا قطب الدین کاشانی کے مابین مخالفت ومعاندت کی صورت پیدا ہوگئی۔ مولانا کو صوفیا اور ان کی تحریک پر یقین نہیں تھا۔ اکثر کوئی شرعی مسئلہ ان دونوں کے مابین معارضہ کا سبب بن جاتا تھا۔ لیکن شیخ بہاء الدین کے فضل وکمال کی شہرت اور ارادت مندان حضرت شہاب الدین کے درمیان ان کی مقبولیت اور اعتبار نے انھیں ملتان میں نہایت محترم مقام پر پہنچا دیا۔

حضرت بہاء الدین اس دیار میں اس وقت کے سیاسی اوضاع سے غیر متعلق نہیں تھے۔ چنانچہ جب سلطان شمس الدین نے سندھ اور ملتان کو اپنی سلطنت کا حصہ بنانا

چاہا تو حضرت بہاء الدین نے ان کی حمایت اس بنا پر کی کہ چنگیز خاں کی یورش سے ناصر الدین قباچہ کی قوت کمزور ہوگئی تھی اور امور سلطنت کے انتظام پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی تھی۔ ایسی صورت میں حضرت نے سلطان شمس الدین التمش کو سندھ پر لشکر آرائی کی دعوت دی۔ سندھ و ملتان جب دہلی سلطنت کے حصے بن گئے تو حضرت بہاء الدین اور سلطان التمش کے روابط استوار تر ہوگئے۔ اور نجم الدین صغریٰ کو منصب شیخ الاسلام سے برطرف کر دینے کے بعد سلطان شمس الدین نے بہاء الدین ذکریا کو اس عہدے پر منصوب کیا۔ بہاء الدین ذکریا سیاسی معاملات میں اپنی وابستگی کو حد اعتدال کے اندر رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی مشغولیت فقط اپنے احباب اور اشخاص پسندیدہ کے حق میں سلطان سے سفارش کرنے تک محدود تھی۔ مغلوں کے پے در پے حملوں سے ساکنان ملتان کی زندگی آزردہ و اذیت ناک ہوگئی تھی۔ لیکن شیخ کی موجودگی ان کے لیے موجب سعادت و رحمت تھی۔ جب ذوالحجہ ۶۴۴ھ میں مغلوں نے قلعۂ ملتان کا محاصرہ کر لیا اس وقت شیخ ذکریا نے ملک شمس الدین کے توسط سے جو مغلوں کی فوج میں ایک منصب دار تھا، مغلوں کو مصالمت پر آمادہ کیا تھا۔

سلسلۂ سہروردیہ کے بارے میں کچھ ایسی حکایتیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے صوفیا نہایت عسرت و تنگدستی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن شیخ بہاء الدین ذکریا شیخ الاسلام کے منصب پر متمکن ہونے سے قبل بھی صاحب ثروت بزرگ تھے۔ ایک بار والیٔ ملتان کو اناج کی ضرورت آن پڑی تو اناج سے بھرا ہوا ایک پورا بھنڈار شیخ نے والیٔ ملتان کے اختیار میں دے دیا۔ اس کے ساتھ چاندی کے سکوں سے بھرا ہوا ایک ظرف بھی اناج میں شامل تھا جسے والیٔ ملتان نے واپس کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے ان کے تموّل و تونگری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت بہاء الدین کے مراسم چشتیہ بزرگوں، مثلاً شیخ فرید اور خواجہ بختیار کاکیؒ سے نہایت صمیمانہ تھے۔

حضرت بہاء الدین سالکان طریقت کو یہ ہدایت فرماتے تھے کہ انھیں ایک

سے زیادہ مرشدوں سے رہنمائی حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ اور فریضۂ نماز کو ہر حال میں بجالانے کی تاکید کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ترک صلوٰۃ مسلمان کے لیے موت جیسا ہے اور اس کے مقابلے میں نفل عبادات اور اوراد و اذکار کو ثانوی اہمیت کی چیز سمجھتے تھے۔

ایک بار جب ان کے کچھ مرید ایک تالاب میں وضو کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں وہاں پر حضرت بہاء الدین کا ورود ہوا۔ سارے مرید وضو کو نامکمل چھوڑ کر پیر کے احترام واکرام کے لیے دوڑ پڑے بجز ایک مرید جو وضو کے جملہ ارکان کو مکمل کرنے کے بعد پیر کے حضور میں آیا۔ شرعی حکم کو فوقیت دینے کی بنا پر وہ مرید حضرت کی نظر میں ستائش وتحسین کا مورد بنا۔

چشتیوں کے طریقہ سے ہٹ کر حضرت بہاء الدین متصلاً روزے نہیں رکھتے تھے اور گاہی گاہی سماع کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ دیگر معتبر صوفیا کے مانند حضرت بہاء الدین بھی حق تعالیٰ کی طرف مکمل طور پر متوجہ و مشغول ہونے کے لیے دلوں کا دوسرے خیالات سے تخلیہ لازم سمجھتے تھے اور پابندی و پیوستگی سے ذکر کی تعمیل کی ہدایت فرماتے تھے۔ اور مریدوں کو گفتار و کردار میں نفس کو اپنے قابو میں رکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ شیخ بہاء الدین کی وفات ۷/صفر ۶۶۱ھ کو ہوئی۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے دوسرے معروف خلیفہ جن کا ورود ہندوستان میں ہوا، سید نورالدین مبارک غزنوی تھے۔ ان کے اوائل زندگی کے واقعات معلوم نہیں ہیں، لیکن جس وقت دہلی میں ان کا ورود مسعود ہوا تھا تو ان کی شہرت عروج پر تھی اور سلطان التمش نے انھیں شیخ الاسلام کے عہدے پر منصوب کیا تھا۔ اہل دہلی ان کے فضل و دانش کا احترام کرتے تھے اور انھیں میر دہلی کا لقب دیا تھا۔ اکثر وہ بارگاہ سلطانی میں تشریف لاتے تھے۔ ان کے خیال میں عدلیہ کے جملہ قوانین وضوابط ناقص تھے کیونکہ یہ ساسانی بادشاہوں کی تقلید میں بنائے گئے تھے۔ مذہب اسلام کی محافظت کے لیے کچھ اصول بتائے تھے۔ مثلاً سلاطین کو اسلامی آداب و رسوم کی ترویج کرنی چاہئے، شراب

خواری، فسق وفجور کے ارتکاب سے اسلامی شہروں کو پاک ہونا چاہئے۔شریعت کے نفاذ کا فریضہ پرہیز گار اور خداترس عہدہ داروں کو سونپنا چاہئے جنھیں شریعت وطریقت کے علوم میں کامل دسترس حاصل ہو۔فلسفیوں کو ملک سے باہر نکال دینا چاہئے اور فلسفہ کی تعلیم کو اسلامی ملکوں میں ممنوع قرار دینا چاہئے وغیرہ۔ان میں بعض باتیں جن کا تعلق غیر مسلموں سے ہے، باہمی مصالحت، ہم زیستی، اور مذہبی رواداری کے یکسر خلاف ہیں۔یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ بعض صوفیوں کے بھی ذہن وضمیر پر عدم تحمل، تشدد اور انتہا پسندی کا غلبہ ہوتا تھا۔نہ صرف انھوں نے مشرکوں، کافروں اور برہمنوں سے غیر بشر دوستانہ سلوک کی نصیحت کی ہے بلکہ شیعان علی کی تذلیل وتحقیر کا بھی مشورہ دیتے ہیں۔سید نورالدین کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی اور وہ شمسی حوض کے نزدیک مدفون ہوئے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے سب سے زیادہ صاحب فضل و دانش خلیفہ قاضی حمید الدین ناگوری تھے جن کی شناخت کو چشتی بزرگ حمید الدین سوالی سے مختلف سمجھنا چاہئے۔ان کے والد ماجد کا نام عطاء اللہ محمود تھا۔ان کا خانوادہ بخارا سے کوچ کر کے دہلی آ گیا تھا۔شیخ حمید ناگور میں تین سال تک قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔اس زمانے میں بدایوں کے محدث رضی الدین حسن مرتب ''مشارق الانوار'' ناگور میں موجود تھے۔ان کے درسِ حدیث کی مجلسوں میں شیخ حمید شریک ہوتے تھے۔اس کے کچھ دنوں بعد شیخ حمید بغداد چلے گئے جہاں انھوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی کے ارادت مند ہونے کی سعادت حاصل کی۔وہاں ان کی ملاقات خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی۔شیخ حمید پھر وہاں سے بہت سارے شہر ودیار کا سفر کرتے ہوئے دہلی پہنچے، اس وقت تک خواجہ بختیار کاکیؒ دہلی میں مقیم ہو چکے تھے۔

شیخ حمید اگرچہ سہروردی صوفی تھے لیکن وہ سماع کی محفلوں کے دلدادہ تھے۔اور علماء کی مخالفت کے باوجود وہ اس صوفیانہ روش کی ترویج وترقی میں مشغول رہے۔شیخ حمید الدین اور علماء کے درمیان سماع کے جواز پر ایک طویل عرصے تک بحثیں ہوتی رہیں۔قاضی

منہاج سراج جو سماع کے شائق تھے، اس قضیہ میں شیخ کے حامی تھے۔ شیخ حمید ایک پاکیزہ دل صوفی ہونے کے ساتھ علم فقہ میں بھی عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت وحذاقت سے علماء کو اپنے اوپر غالب ہونے نہیں دیا۔ ان کی تصنیفات سہروردیہ اور چشتیہ دونوں سلسلہ کے صوفیوں میں مقبول تھیں۔

ان کے آثار میں لوائح، عشقیہ، رسالہ من کلام اور ''طوالع الشموس'' وغیرہ شامل ہیں۔ صوفی تحریک میں شیخ حمید کی مساعی لائق تحسین ہیں لیکن وہ لوگوں کو مرید کرنے میں بہت محتاط تھے۔ لہٰذا ان کے ارادت مندوں کی تعداد انگشت شمار ہے۔ ان کے ایک مرید کا نام شیخ احمد نہروانی تھا جو پیشہ کے اعتبار سے جولاہ تھے۔ اور ان کے دوسرے مرید شیخ عین الدین تھے جو قصّاب تھے اور ان کے تیسرے مرید شیخ شاہی موتاب تھے جو بدایوں میں رہتے تھے۔ شیخ حمید کے چوتھے مرید خواجہ محمود موئنہ دوز تھے۔ شیخ حمید کا مزار خواجہ بختیار کاکیؒ کے مرقد اقدس کے قریب ہے۔

شہاب الدین سہروردی کے مریدوں میں جنھوں نے برصغیر میں رہ کر ہدایت وارشاد کے عظیم کاموں کی بنا پر نہایت محترم مقامات پر پہنچے، ان میں حضرت بہاء الدین ذکریا کے بعد حضرت جلال الدین تبریزی تھے جنھوں نے بنگال میں بڑی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے مختلف شہروں میں اکتساب علم کیا۔ شیخ جلال الدین اور ان کے والد ماجد شیخ ابوسعید تبریزی کے ارادت مند تھے۔ لیکن شیخ ابوسعید کی وفات کے بعد شیخ جلال الدین بغداد چلے گئے اور وہاں شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمرۂ مریدان میں شامل ہوگئے۔ شیخ شہاب الدین پیرانہ سری کے مرحلے میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہر سال سفر حج بیت اللہ ضرور کرتے تھے۔ شیخ شہاب الدین کو ضعیفی کے سبب ماکولات سرد مضرّت کا باعث ہوتے تھے اس لیے شیخ جلال الدین تبریزی نے ان کے لیے کھانے کو گرم رکھنے کے لیے ایک خاص قسم کا چولہا بنایا تھا۔ ان کے پیر جب سفر پر ہوتے تھے تو شیخ جلال الدین اس چولہے کو سر پر لے کر ساتھ ساتھ چلتے تھے اور حسب ضرورت ان کو گرم

کھانے پیش کرتے تھے۔ سات سال تک حضرت جلال الدین نے خلوص وعقیدت کے ساتھ ان کی خدمت کی۔

حضرت جلال الدین تبریزی اور شیخ بہاء الدین ذکریا کے مابین دوستانہ تعلق تھا۔ بغداد سے نیشاپور کا سفر دونوں نے ساتھ کیا تھا۔ حضرت جلال الدین کو فقرا وصوفیا سے ملاقات کا شوق تھا۔ جب کہ شیخ بہاء الدین ذکریا اپنے اوقات ذکر وفکر میں گزارتے تھے۔ نیشاپور میں شیخ جلال الدین تبریزی نے معروف صوفی شاعر فریدالدین عطّار سے ملاقات کی تھی۔ ملاقات کے بعد جب وہ اپنی اقامت گاہ کو لوٹے تو بہاء الدین ذکریا سے اس ملاقات کی کیفیت بیان کی اور کہا کہ وہ شیخ عطّار کے دیدار اور ان کی صحبت سے اس درجہ مغلوب ومتاثر ہوگئے کہ اپنے پیر کا رخ پُر نور بھی ان کے حافظہ سے محو ہوگیا۔ حضرت بہاء الدین شیخ جلال الدین تبریزی کے اس جملہ سے بے حد بدحظ ہوئے جس کے سبب حضرت ذکریا نے تنہا سفر کا ارادہ کرلیا۔

شیخ جلال الدین پھر ملتان اور اجودھان ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ جہاں سلطان شمس الدین التمش نے ان کا پُر جوش استقبال کیا۔ لیکن یہاں شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ سے ان کے تعلقات مخلصانہ نہیں رہے۔ نجم الدین صغریٰ ہمیشہ ان کے درپئے آزار رہتے تھے۔ مختلف قسم کے الزامات میں ان کو الجھاتے رہے لیکن ان پر رکھے گئے سارے الزامات محضر میں بے بنیاد ثابت ہوئے۔ بنگال میں شیخ جلال الدین کے بہت سے ارادت مند تھے۔ اپنے سفر بنگال میں سب سے پہلے لکھنوتی میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہاں ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور اس کے ساتھ ایک لنگر کا بھی انتظام کیا۔ انھوں نے خانقاہ کی کفالت کے لیے کچھ باغات اور حاصل خیز زمینیں بھی خریدیں۔ اس کے بعد وہ پانڈوا کے نزدیک دیوا تال چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے ایک خانقاہ بنوائی اور وہاں کی مقامی آبادی کے بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ وہ اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیان مقبول تھے۔ دیوتالا کا نام تبریز آباد ہوگیا۔ جلال الدین کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا ہے اور ان کے بنگالی خلفاء کی بابت بھی کوئی اطلاع نہیں ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفا ہندوستان کے طول وعرض میں موجود تھے۔ لیکن اس سلسلہ کی مربوط و مسلسل تاریخ خواجہ بہاء الدین ذکریا کے خلفا کے توسط سے مرتب ہوتی ہے۔ خواجہ بہاء الدین نے اپنے فرزند صدرالدین عارف کو اپنا خلیفہ بنایا۔ شیخ صدرالدین کے تعلقات بلبن کے بیٹے شاہزادہ محمد سے محبت آمیز تھے۔ ان کی خانقاہ کو شاہزادہ کے ذریعہ مالی اعانت حاصل ہوتی تھی۔ شیخ صدرالدین علم وفضل سے آراستہ تھے۔ شیخ عبدالحق کی تحریر کے مطابق شیخ صدرالدین کے ایک مرید خواجہ ضیاء الدین نے اپنے پیر کے ملفوظات موسوم بہ کنوز الفوائد کو مرتب کیا تھا۔ اگرچہ اس تصنیف کا اب پتہ نہیں چلتا ہے لیکن اس کے کچھ اقتباسات ''اخبار الاخیار'' میں موجود ہیں۔ مثلاً ذکر کے فوائد سے متعلق بحث ہے۔ صوفی کو بجز حق تعالیٰ کے کسی اور شے کی جانب اپنے دل کو منعطف نہیں کرنا چاہئے۔ اسے جنت کے لطف ونشاط اور دوزخ کے عقوبت وعذاب سے بے پروا ہونا چاہئے اور داخل وخارج ہونے والے انفاس ذکر سے خالی نہ ہونے چاہئیں۔ شیخ صدرالدین کی وفات ۲۳/ ذی الحجہ ۶۵۴ھ کو ہوئی۔ شیخ بہاء الدین ذکریا کے رشتۂ ارادت سے کثیر تعداد میں جویندگان حق وابستہ تھے۔ ان میں سے ایک نہایت معتبر وعالی قدر مرید سید جلال الدین بخاری تھے۔ وہ اوّلاً بخارا سے کوچ کر کے بھکر میں وارد ہوئے۔ لیکن وہاں کے مقامی اشخاص کے حِقد وحسد سے تنگ آکر وہ اُوچ چلے گئے اور اس جگہ تادم حیات سکونت پذیر رہے۔

حضرت بہاء الدین کے ایک بے سواد مرید حسن افغان تھے۔ شیخ، حسن افغان کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ بہاء الدین ذکریا کے صاحب فضل دوست مرید شیخ فخرالدین ابراہیم معروف و متخلص بہ عراقی ان کے لیے موجب افتخار تھے۔ ان کا تعلق ہمدان کے مضافات سے تھا جہاں انھوں نے حفظ قرآن کے دور کی تکمیل کی اور ہمدان میں ایک عالی شان مدرسے کی تعمیر کرائی جہاں وہ اپنے خطبات ایراد کرتے تھے۔ ایک بار قلندروں کی ایک جماعت ان کے مدرسے میں آکر ٹھہری۔ اس طایفہ میں ایک خوبرو امرد بھی تھا

جس پر عراقی فریفتہ ہو گئے تھے۔ اور اپنے تدریسی پیشہ کو ترک کر کے قلندر کے بھیس میں اس طایفہ کے تعاقب میں نکل گئے جس میں وہ امرد شامل تھا۔ بہر حال اپنے پیر کی توجہ اوران کی برکت وسعادت کے زیر اثر ان کا عشق مجازی، عشق حقیقی میں بدل گیا۔ عراقی اساساً ایک شاعر تھے۔ وہ اپنے عواطف درون کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتے تھے۔ لیکن ان کے پیر شیخ بہاءالدین شعروشاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی عراقی کے اس فطری ذوق کو انھوں نے برداشت کرلیا۔

عراقی کے اشعار میں عاشق، معشوق، اور خود عشق کی وحدت کے جو اشارات ملتے ہیں ان سے حضرت بہاءالدین اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے عراقی کی روحانی تربیت کو مکمل قرار دے دیا اور اپنا خرقہ انھیں ہدیۂ بخش دیا اور پھر اپنی دختر کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔ اور اپنی وفات سے پہلے ان کو اپنا خلیفہ بھی بنایا۔ لیکن حضرت بہاءالدین کی وفات کے بعد عراقی کو وہاں کے کچھ لوگوں کے بغض و عناد کے سبب ۱۲۶۳ء میں میں ملتان چھوڑنا پڑا۔ عراقی پہلے حج کی مسافرت پر روانہ ہوئے پھر مکہ سے قونیہ آئے اور ''فصوص الحکم'' کے موضوع پر شیخ صدرالدین کے خطبات کی مجلسوں میں شریک رہے۔ اور اپنا معروف رسالہ ''لمعات'' جو ابن عربی کے دقیق صوفیانہ فلسفہ کی شرح و توضیح ہے فارسی زبان میں تحریر کیا۔ قونیہ سے عراقی مصر کے لیے روانہ ہوئے، وہاں کے سلطان عراقی کے ہاتھ پر مرید ہو گئے۔ مصر سے عراقی پھر شام آئے، وہاں کے عمائدین شہر نے ان کا سرگرم استقبال کیا تھا۔ عراقی کی وفات ۸/ذیقعدہ ۶۸۸ھ کو ہوئی۔ عراقی کا دیوان اور ایک مثنوی بعنوان ''عشاق نامہ'' ہے جس میں عشق خداوندی، مستی و وارفتگی، شور و فریاد، اضطراب و بیقراری کو بڑے دل انگیز انداز میں منظوم کیا گیا ہے۔ اپنی وفات سے پہلے عراقی نے اپنے ''لمعات'' کی ایک نقل شیخ صدرالدین عارف کو ابن عربی کے افکار کی تشہیر و اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ عراقی کے چند اشعار مثالاً درج کیے جاتے ہیں:

نخستین بادہ کاندر جام کردند　　　ز چشم مست ساقی وام کردند

لب میگون جانان جام درداد　　شراب عاشقانش نام کردند
بہ عالم ہرکجا درد و غمی بود　　بہم کردند و عشقش نام کردند
چو خودکردند راز خویشتن فاش　　عراقی را چرا بدنام کردند

شیخ صدرالدین عارف کے ایک صاحب کمال مرید موسوم بہ امیر حسین فرزند علیم بن ابوالحسن الحسینی تھے۔لیکن جمالی امیر حسن کو شیخ بہاء الدین ذکریا کا مرید بتاتے ہیں ۔ امیر حسن کا ایک ادبی کارنامہ موسوم بہ ''نزہت الارواح'' ان کی زندگی کے واقعات کی تاریخوں کو متعین کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا ہے اوران کے حالات سے متعلق جومشکوک اطلاعات ہیں ان کا ازالہ کرتا ہے۔اس کتاب کے آخری باب میں امیر حسن لکھتے ہیں کہ اس نے یہ کتاب ۷۱۱ھ میں لکھی تھی جب کہ ان کی عمر چالیس سال کی تھی۔ایسی صورت میں ان کا تولد ۶۷۱ھ میں ہوا ہوگا۔امیر حسن غور کے ایک قریہ ''غزو'' میں متولد ہوئے تھے۔مقدماتی تعلیم انھوں نے اپنے وطن میں حاصل کی ۔پھر وہ ملتان چلے گئے جہاں شیخ صدرالدین سے مرید ہوئے ۔ایک مثنوی موسوم بہ ''کنز الرموز'' میں امیر حسن نے شیخ شہاب الدین سہروردی، بہاءالدین ذکریا اور شیخ صدرالدین کی منقبتیں بیان کی ہیں ۔ وہ ملتان میں طویل عرصے تک مقیم رہے اور سلطان جلال الدین فیروز خلجی کی مدح وستائش میں اشعار لکھتے رہے ۔ اس کے بعد وہ ہرات چلے آئے ۔۱۳۱۱ء میں انھوں نے تبریز کے معروف صوفی سعدالدین محمود شبستری کو ایک مکتوب لکھا تھا جس کے ذریعہ تصوف سے متعلق پندرہ سوالات کے جوابات کی درخواست کی تھی۔

امیر حسن نے تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ان کی تصنیف ''نزہت الارواح'' میں دونوں کا امتزاج ہے۔اور اپنے زمانے کی اہم متصوفانہ کتابوں میں شمار ہوتی تھی ۔امیر حسین کی کتاب ''زادالمسافرین'' میں سنائی کی ''حدیقۃ الحقیقت'' اور سعدی کی گلستان کی تقلید کے شواہد ملتے ہیں ۔ ''کنز الرموز'' میں امیر حسین اہل اسلام سے کہتے ہیں کہ وہ باتیں جو اپنے لیے مناسب سمجھتے ہیں وہی دوسروں کے حق میں بھی لازم سمجھیں۔

امیر حسن کے شعری ذوق نے انھیں سماع کا بھی شائق بنا دیا۔ جسے وہ صوفیوں کا مخصوص رویہ تصور کرتے تھے۔صوفیان صادق ان کے خیال کے مطابق ایک روحانی لشکر کے مانند ہیں۔ان کی طبیعت میں ہوا وہوس کی موجودگی تقویٰ وورع کے طریقے کے خلاف ہے۔ریاکار صوفیوں کے روّیہ میں عیش ونشاط، سرور ومستی، طریقت ہے۔اور لذیذ غذائیں طرب وشادکامی پارسائی ہے۔ترکِ نماز اور اوراد وعبادات سے کنارہ کشی اور احکام شرعیہ کی مخالفت حقیقت ہے۔

شیخ صدر الدین کے ایک معروف مرید مولانا حسام الدین تھے۔جو بدایوں منتقل ہو گئے تھے اور تمام عمر اسی جگہ مقیم رہے۔ان کے مریدوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔شیخ صدر الدین کے مرید شیخ احمد معشوق قندھار کے باشندہ تھے جہاں ان کے والد تجارت کے پیشہ سے وابستہ تھے۔احمد معشوق شراب خور تھے۔اکثر وہ اپنے والد کے تجارتی سفر میں ان کے ہمراہ ملتان آتے تھے۔ایک بار ایسا ہوا کہ شیخ صدر الدین ایک دکان سے گزر رہے تھے جہاں احمد معشوق اپنے تجارتی کام میں مشغول تھے۔شیخ نے اپنی اقامت گاہ پہنچ کر ایک ملازم کو احمد معشوق کے پاس بھیجا اور انھیں اپنی جائے سکونت میں آنے کی دعوت دی۔احمد معشوق ان کے گھر پر آئے۔شیخ نے احمد معشوق کے پہنچنے پر شربت سے بھرے ہوئے ایک جام میں سے تھوڑا نوش فرمایا اور باقی ماندہ شربت احمد معشوق کو پیش کیا۔احمد نے اس مشروب کو پیا جس کے زیر اثر ان کا قلب وذہن روحانی روشنی سے مملو ہو گیا۔وہ شیخ صدر الدین کے مرید ہو گئے۔اپنی تمام جائداد کو فقراء میں تقسیم کر دیا اور سات سال تک دنیا سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو گئے اور ذکر وفکر میں مستغرق رہے۔

شیخ صدر الدین کے جانشین ان کے فرزند شیخ رکن الدین ابوالفتح تھے۔ان کی والدہ ایک پارسا و پرہیزگار خاتون تھیں۔شیخ بہاء الدین ذکریا نے ان کی شہرت و نام آوری کی بابت اس وقت بشارت دی تھی جب وہ ابھی شکم مادر میں تھے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ حکومت میں شیخ رکن الدین دوبار دہلی کی مسافرت کی۔سلطان بہ نفس نفیس ان کے استقبال کے لیے گیا اور ان کو ساتھ لے کر شہر میں داخل ہوا۔

شیخ رکن الدین حضرت نظام الدین اولیا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سلطان قطب الدین کے زمانۂ حکومت میں شیخ رکن الدین تین بار سلطان کی دعوت پر آئے۔ سلطان سمجھتا تھا کہ حضرت رکن الدین کی شہر دہلی میں موجودگی سے حضرت نظام الدین اولیاء کی عظمت و اہمیت میں کمی آئے گی۔ وہ ایسا چاہتا تھا۔لیکن دونوں بزرگوں کے مابین مخلصانہ دوستی اور باہمی محبت ومودت نے سلطان کے ناشایستہ مقصد کو ناکام بنا دیا۔ اور دہلی کے ہر سفر میں رکن الدین نے حضرت نظام الدین اولیا سے ملاقات کی۔

قطب الدین کی حکومت کے ایام میں جب حضرت رکن الدین کا شہر دہلی میں ورود ہوا تو حضرت نظام الدین اولیا نے آگے جا کر ان کا خیر مقدم کیا۔سلطان قطب الدین نے ان سے سوال کیا کہ دہلی کے اعیان واشراف میں سے کس نے سب سے پہلے ان سے ملاقات کی۔ حضرت رکن الدین نے بلاتردد حضرت نظام الدین اولیا کا نام لیا۔ دہلی میں شیخ رکن الدین کے دوسرے مرتبہ کے ورود میں انھوں نے شیخ نظام الدین سے کیلوکھری کی مسجد میں ملاقات کی۔اس کے بعد حضرت رکن الدین ان سے ملاقات کے لیے غیاث پور بھی گئے۔حضرت نظام الدین شیخ رکن الدین کی پالکی میں تشریف فرما ہوئے اور کچھ دیر تک مذہبی امور پر گفتگو ہوتی رہی۔

شیخ نظام الدین اولیا کی وفات کے بعد شیخ رکن الدین دہلی میں مقیم رہے۔ سلطان محمد بن تغلق اور شیخ رکن الدین کے مابین بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔

۱۳۲۷ء میں بہرام کشلو خان والیٔ ملتان نے سلطان محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کی۔سلطان اس کی سرکوبی کے لیے ملتان کی جانب ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ شیخ رکن الدین نے اس کی روانگی کے وقت اس سے ملاقات کی تھی اور اس کی فتح یابی کی پیش گوئی کی تھی۔ ابوہر کے نزدیک یہ جنگ وقوع پذیر ہوئی تھی۔ جنگ کے آغاز میں دشمن شاہی فوج پر غالب ہو رہی تھی لیکن انجام کار شاہی لشکر نے باغیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔بہرام قتل کر دیا گیا۔اور دشمنوں کی فوج منہزم ہوگئی۔سلطان نے شیخ رکن الدین کو ان کی خانقاہ کی کفالت کے لیے ایک سو دیہات ہدیتہً دیئے۔لیکن سلطان اس

بغاوت کے سبب غیظ وغضب کے عالم میں تھا اور شہر کے تمام ساکنان کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن ضیاء الدین برنی کی تحریر کے مطابق شیخ رکن الدین کی شفاعت سے شہر کی آبادی محفوظ رہی۔ شیخ عبدالحق دہلوی شیخ رکن الدین کی متعدد درسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جو اب دستیاب نہیں ہیں۔ شیخ رکن الدین کی وفات ۷۲۵ھ میں ہوئی۔

جمالی کنبوہ نے جیسا تحریر کیا ہے شیخ رکن الدین کے برادرزادہ شیخ اسمٰعیل ان کے جانشین ہوئے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شیخ رکن الدین نے اپنے پوتے ہود کو جانشینی کے لیے نامزد کیا تھا۔ لیکن ان کے برادرزاد نے ہود کے دعویٰ کی مخالفت کی تھی۔ یہ تنازع فیصلہ کے لیے سلطان محمد بن تغلق کے تحت ملاحظہ رکھا گیا جنھوں نے شیخ ہود کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کچھ دنوں کے بعد والیٔ سندھ نے شیخ ہود پر شیخ رکن الدین کی خانقاہ کی آمدنی کو بے ایمانی اور بددیانتی کی راہ پر چل کر اپنے ذاتی مصارف میں لانے کا الزام لگایا۔ سلطان نے والیٔ ملتان کو خانقاہ کی ساری جائیداد کو اپنے اختیار میں کر لینے کا حکم دیا۔ شیخ بدبختی و بدحالی کے شکنجے میں آگئے اور وہ راہِ فرار اختیار کر کے ماوراء النہر کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن سلطان کو شیخ کے منصوبے کی خبر ہوگئی اور اس نے شیخ کو ہندوستان پر مغلوں کو حملہ آور ہونے کی ترغیب کے جھوٹے الزام میں قتل کر دیا۔ اور اس واقعہ کے بعد شیخ بہاء الدین ذکریا کی خانقاہ کا فروغ و رونق مائل بہ تنزل ہوگیا۔ اگرچہ سہروردیہ سلسلہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں ارتقا کی راہ پر قائم رہا۔ شیخ رکن الدین کے مریدوں میں اہم ترین شخصیت شیخ عثمان کی تھی۔ وہ قاضی وجیہ الدین کے فرزند تھے۔ شیخ رکن الدین انھیں دھلی سے ملتان لے آئے تھے۔ شیخ رکن الدین سے ارادت حاصل کرنے کے بعد شیخ عثمان ایک ریاضت کش اور عبادت گزار صوفی ہوگئے۔ اپنے پیر کی اجازت سے حضرت عثمان زیارت حرمین کے لیے روانہ ہوگئے، مکہ میں ایک سال کی اقامت کے بعد وہ چھ سال تک مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے ملتان لوٹ آئے۔ لیکن وہاں زیادہ دنوں تک مقیم نہ رہے اور دہلی چلے آئے۔ شیخ عثمان اور حضرت نظام الدین اولیا کے درمیان نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ دہلی میں سلسلۂ چشتیہ سے ربط

وقربت کے زیر اثر حضرت عثمان کی طبیعت میں سماع کا ذوق پیدا ہوگیا۔ لیکن سلطان کو سماع سے نفرت تھی۔ ایک دن شیخ عثمان کے ایما پر حضرت نظام الدین کے پسندیدہ قوال امیر حسن نے نغمہ سرائی شروع کی۔ امیر حسن کی ترنم ریز آوازہ خوانی سن کر شیخ بیخود و سرمست ہوگئے۔ پھر قوالوں اور صوفیوں کی یہ جماعت جب ناچتے گاتے ہوئے سلطان کے دربار پہنچی تو سلطان بہت خشمگیں ہوا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ رامش وطرب کے اس طایفہ کے سردار حضرت عثمان ہیں تو سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور انھوں نے اس ٹولی کو دربار کے اندر نغمہ چھیڑنے کی اجازت دے دی۔

شطاریہ سلسلہ:

ہندوستان میں شطاریہ سلسلہ پندرہویں صدی عیسوی میں متعارف ہوا۔ اصالتاً یہ سلسلہ بسطامیہ سلسلہ کی ایک شاخ ہے۔ اس سلسلہ کے عقاید وافکار اور شیوۂ عمل پر حضرت امام جعفر صادق اور ابو یزید بسطامی کے روحانی کارناموں کا اثر پڑا ہے۔ ترکی میں یہ سلسلہ بسطامیہ کہلاتا تھا اور ایران و ماوراء النہر کے علاقے میں عشقیہ کے نام سے مشہور ہوا جب کہ ہندوستان میں یہ سلسلہ شطّاریہ کہلاتا ہے۔

پندرہویں صدی عیسوی میں جب مرکزی ایشیا میں نقشبندیہ سلسلہ کی مقبولیت بڑھنے لگی تو عشقیہ سلسلہ وہاں روبہ زوال ہونے لگا تھا۔ اس زمانے میں شاہ عبداللہ جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے اخلاف میں سے تھے اس دیار سے کوچ کر کے ہندوستان چلے آئے اور اس سلسلہ کا نام یہاں ہندوستان میں شطاریہ رکھا۔

شاہ عبداللہ بخارا کے قریب متولد ہوئے تھے جہاں وہ عشقیہ سلسلہ میں شیخ محمد عارف کے ہاتھ پر مرید ہوئے۔ ہندوستان میں وارد ہونے سے قبل شاہ عبداللہ نے نیشاپور، عراق اور آذربائیجان کا سفر کیا تھا۔ ہندوستان میں مانک پور اور جونپور میں ان کی صوفیانہ تحریک کا پتہ چلتا ہے۔ مانک پور میں ان کی ملاقات شیخ حسام الدین مانکپوری متوفی ۸۵۳ھ اور راجی سید حمید شاہ سے ہوئی۔ شاہ عبداللہ نے سید محمد اشرف جہانگیر

سمنانی سے بھی ملاقات کی، اور جونپور میں انھوں نے شیخ حافظ جونپوری کو اپنے ارادتمندوں میں شامل کیا۔ جونپور میں شاہ عبداللہ کے مریدوں کی سرگرمیوں کے فروغ کو دیکھ کر سلطان ابراہیم شاہ شرقی بھی متحیر ہو گئے تھے۔ شاہ عبداللہ یہاں سے بنگال کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں کے مقامی صوفیوں سے کہا یا تو انھیں وہ طریقت کے رموز بتائیں یا وہ ان سے سیکھیں۔ مساعد حالات نہ ہونے کے سبب شاہ عبداللہ مالوہ چلے گئے۔ پھر یہاں سے ۸۴۶ھ میں وہ چتوڑ گئے۔ شطاریہ سلسلہ بنگال، مالوہ اور دوسرے مقامات میں شاہ عبداللہ کے معروف مریدوں کے توسط سے توسیع و ترقی کی راہ پر چلنے لگا۔ اور سولہویں صدی کے اواخر تک برہانپور گجرات اور بنگال میں اس سلسلہ نے بڑی استواری سے اپنے قدم جما لیے۔ شاہ عبداللہ نے ایک رسالہ بعنوان ''لطائف غریبہ'' لکھ کر سلطان غیاث الدین کے نام معنون کیا تھا۔ اس اہم رسالے میں شاہ عبداللہ نے شطاریہ طریقے کی تعلیمات و ہدایات کو بیان کیا ہے۔ شاہ عبداللہ کے بعد اس سے وابستہ دوسرے صوفیوں نے مثلاً شیخ بہاء الدین اور شیخ محمد غوث نے ''لطائف غریبہ'' کی بنیاد پر اس سلسلہ کی تشکیل جدید کی تھی۔ اس رسالے میں شاہ عبداللہ نے مسلم صوفیا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اخیار، ابرار اور شطار۔

ان کی تحریر کے مطابق ان تینوں کی عبادت و ریاضت اور ذکر و فکر کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ۸۹۰ھ میں شاہ عبداللہ کی وفات ہوگئی اور وہ مانڈو میں مدفون ہوئے۔ ان کے معروف بنگالی خلیفہ شیخ محمد علا تھے۔ جنھوں نے شروع میں شاہ عبداللہ سے مرید ہونا پسند نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں ایسا کرنے پر پشیمان ہوئے تھے اور مانڈو پہنچ کر شاہ عبداللہ کے ارادت مند ہو گئے اور بعد میں ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔

شیخ علا بنگال میں سلسلۂ شطاریہ کے نہایت سرگرم مبلغ تھے۔ ان کے مرید اور خلیفہ شیخ ظہور بابا ان کے نہایت مخلص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ شیخ علا کی وفات کے بعد انھوں نے ان کے فرزند ابوالفتح ہدایت اللہ کو طریقۂ شطاریہ کی تربیت دی اور جب

شیخ ظہور نے شیخ ابوالفتح کو اپنے والد کی جانشینی کے لائق سمجھا تو انھوں نے وہ خرقہ جو انھیں شیخ علا سے ملا تھا، شیخ ابوالفتح کے حوالے کر دیا اور خانقاہ کو چھوڑ کر عزلت نشین ہو گئے۔

جون ۱۵۳۸ء میں مغل بادشاہ ھمایوں نے جس کو شطاریہ سلسلہ سے بڑی عقیدت تھی بنگال کو اپنے تصرف میں لے لیا اور افغانوں کے خلاف مہم میں اپنی رفاقت میں چلنے کے لیے شیخ ابوالفتح کو آمادہ کر لیا۔ لیکن جون ۱۰۳۹ء میں شیر شاہ نے مغل بادشاہ کو چوسہ میں سخت ہزیمت سے دوچار کیا۔ شاہ ہمایوں کی فوج نے راہِ فرار اختیار کی۔ شیخ ابوالفتح پٹنہ چلے آئے جہاں وہ تادمِ واپسیں سکون کے ساتھ سکونت پذیر رہے۔ ان کے فرزند شیخ رکن الدین ان کے جانشیں ہوئے۔ رکن الدین کے معروف خلفاء میں ''گلزار ابرار'' کے مصنف شیخ کمال الدین سلیمان قریشی تھے۔

حافظ جونپوری جو شاہ عبداللہ کے خلیفہ تھے، کے مریدوں کی تعداد معتنا بہ تھی، جو جونپور سے لے کر دہلی تک کے تمام شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے معروف ترین خلیفہ شیخ بدھن شطاری تھے۔ سلطان سکندر لودی کے عہد میں وہ ایک مشہور صوفی تھے۔ ان کی وفات پانی پت میں ہوئی تھی۔ شیخ بدھن کے معروف مریدوں میں رزق اللہ مشتاقی متوفی ۹۸۹ھ جو عبدالحق محدث دہلوی کے عم تھے ''واقعات مشتاقی'' کے مصنف ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں نہایت معروف و معتبر شطاری صوفی شیخ پھول اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ محمد غوث تھے۔ دونوں بھائی شیخ ظہور کے خلیفہ تھے۔ شیخ پھول ملقب بہ فرید الدین احمد کے بارے میں لوگوں کا یقین تھا کہ وہ کراماتی کارنامے انجام دینے پر قادر تھے۔ اور یہ عمل وہ ''دعوت اسمائے حق تعالیٰ'' کے ذریعہ کرتے تھے۔ ان کا معروف اور نہایت مخلص ارادت مند جو ان کے حضور میں بیٹھ کر خارق العادہ قوت وقدرت حاصل کرنے کے قواعد واصول سیکھتا تھا وہ مغل بادشاہ ہمایوں تھا۔ شیخ پھول سے بادشاہ کی عقیدت کے زیر اثر مولانا جلال الدین تتوی جو سلسلۂ سہروردیہ سے وابستہ تھے شیخ پھول کے مرید ہو گئے۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے لطف وکرم کی امید

میں بہت سے مسلمان شطاریہ صوفی بن گئے۔ ۳۹-۱۵۳۸ء میں بادشاہ ہمایوں نے شیخ پھول کواپنے باغی بھائی میرزا ہندال کے پاس مشترک دشمن شیر شاہ سے جنگ کے لیے رضا مند کرنے کی دعوت بھیجی۔ لیکن میرزا ہندال نے ہمایوں کی تجویز کونہیں مانا اور باغی فوج کے سرداروں کے ایما پر شیخ پھول قتل کردیے گئے۔

شیخ محمد غوث جوشیخ پھول کے چھوٹے بھائی تھے وہ بھی شیخ ظہور کے ارادت مند تھے۔ شیخ محمد غوث نے ان سے مابعدالطبیعہ اعمال کواسمائے خدائے سبحان کے ورد کے وسیلے سے انجام دینے کے رموز سیکھے۔ تقریباً تیرہ سال تک شیخ غوث چنار کے غاروں میں ریاضت کش رہے اوراس کے بعد شیخ غوث گوالیار میں مقیم ہوگئے۔ شیخ غوث کا انتقال ۱۷رمضان ۹۷۰ھ کوگوالیار میں ہوا۔ ان کی قبر کےاوپر جوعمارت بنی ہوئی ہے وہ ہندواسلام فن معماری کی ایک نادر مثال ہےاور شیخ محمد غوث کی رواداری اور وسیع القلبی کا نشاندہ ہے۔

شیخ محمد غوث کی متصوفانہ تصنیفات اوران کی نہایت مقبول ومحترم شخصیت سلسلۂ شطاریہ کے فروغ وپیش رفت میں بہت معاون ثابت ہوئیں۔ ان کے آثار لائق توجہ تاثیرات کے موجب ہوئے ہیں اور ہندوستان کی تاریخ تصوف میں انمٹ نشانات چھوڑے ہیں۔ ''جواہر خمسہ'' ان کا اہم ترین صوفیانہ کارنامہ ہے، جس میں بحرالحیات، کلید مخازن، ضمائر بصائر، کنزالوحدت، اور رسالۂ معراجیہ شامل ہیں۔ ''جواہر خمسہ'' کی تاریخ تصنیف ۹۲۶ھ ہے پھر ۹۵۶ھ میں مریدوں کے استدعاء پراس کومرتب کیا گیا اور کچھ نئی چیزوں کا اس میں اضافہ بھی کیا گیا۔ اس میں عقیدت مندوں کوعبادت کی مختلف صورتیں اوراصول بتائے گئے ہیں اورریاضت کشی کےقواعد بیان کیے گئے ہیں۔ اسمائے خداوندسبحان کے ورد کے وسیلے سے اس کے لطف وکرم کے حصول کے طریقے اورشطاریہ صوفیوں کےقواعدوضوابط سے متعلق باتیں ہیں۔ شیخ محمد غوث نے شیخ نجم الدین کبریٰ کے حوالہ سے ارشادفرمایا کہ جنھوں نے تصوف کے ارتقائی سفر میں معتدل راہ کو

طے کر لیا انھوں نے گویا اللہ کی طرف چل کر سفر کرنے کو پسند کیا۔ وہ سائرین تھے۔ اور جنھوں نے پرواز کر کے اس راہ کو طے کیا وہ طائرین تھے۔

شطاری صوفیا اپنے مرام و مقصد کو جذبہ و توفیق الٰہی سے حاصل کرتے ہیں۔ شطاریہ طریقہ سے آگاہی جیسا کہ شیخ محمد غوث فرماتے ہیں تصوف کی مشق و ممارست میں کمال حاصل کرنے اور اسمائے الٰہی کے ورود میں مہارت پیدا کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔ شطاریہ صوفیوں کو مقامِ فنا سے گزرنا ضروری نہیں ہے۔ خداوند قدوس کے اسماء کی برکتوں سے مستفیض ہونے کے بنیادی اصول جلالی اور جمالی کہے جاتے تھے۔ جلالی طریقہ میں گوشت، مچھلی، انڈا، شہد اور جنسی مقاربت سے پرہیز کی ہدایت ہے جب کہ جمالی طریقہ میں مکھن، دودھ، دہی، سرکہ، نمک اور کھجور سے احتراز ضروری ہے۔ اور جو لوگ ایسی ریاضتوں میں مشغول ہوتے ہیں انھیں بغیر سلا ہوا کپڑا پہننا ضروری ہے۔

شیخ محمد غوث کے جانشین ان کے صاحبزادے شیخ بدھ عبداللہ تھے۔ انھوں نے دینی تعلیمات شیخ وجیہ الدین اور مولانا مبارک دانشمند کے حضور میں کی۔ ان کے برادر بزرگ جنھیں شیخ محمد غوث نے خلیفہ بنایا تھا، نورالدین ضیاء اللہ تھے۔ انھوں نے بھی دینی اور ادبی تعلیمات شیخ وجیہ الدین سے حاصل کی۔

شیخ کے ان فرزندوں نے اور ان کے داماد راجی سید مصطفیٰ نے سلسلۂ شطاریہ کی ترویج و اشاعت میں شایستۂ توجہ خدمات انجام دی ہیں۔ اگر چہ گوالیار سلسلۂ شطاریہ کا اہم مرکز تھا جہاں شیخ کے فرزندوں کا اثر و نفوذ بہت زیادہ تھا اور ان کی وجہ سے اس سلسلہ کی توسیع و ترویج میں بہت مدد ملی لیکن تمام برصغیر میں اس سلسلہ کا فروغ و ترقی شیخ محمد غوث کے ارادت مندوں کی مساعی سے ممکن ہوا۔

شیخ محمد غوث کے سب سے زیادہ مکرم و صاحب فضل و کمال خلیفہ شیخ وجیہ الدین احمد فرزند نصراللہ علوی تھے۔ انکا تولد گجرات میں ۹۰۲ھ میں ہوا تھا۔ علوم مقدماتی کی تحصیل کے بعد جوانی کے ایام میں وہ مذہبیات کی سبھی اصناف اور ادب و فلسفہ کے بیشتر

شعبوں کی اعلیٰ تعلیمات میں مشغول رہے۔ اس کے بعد عزلت نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن اس دوران میں وہ اپنے پیر کے بہت سارے ارادت مندوں کی تربیت میں مشغول رہے۔ شطاریہ سلسلہ سے منسلک ہونے کے بعد وہ شیخ محمد غوث کے نہایت سرگرم معتقد بن گئے اور شطاریہ سلسلہ کو مستحکم و منضبط کرنے میں لائق تحسین خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اپنے مدرسے کو خانقاہ میں تبدیل کر دیا۔ تاہم تدریس و تعلیم کی کارگزاریوں سے کبھی جدا نہیں ہوئے۔ اور اس کے ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام سے متعلق موارد پر نہایت عالمانہ تحریریں پیش کرتے رہے۔ ۲۹/صفر ۹۹۷ء کو ان کا انتقال احمد آباد میں ہوا۔ شیخ عبداللہ، فرزند شیخ وجیہ الدین ایک اہل دانش صوفی تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے ان کی تدریسی ذمہ داریوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ نہایت پارسا و پرہیزگار فقیر تھے۔ اکبر کے رضاعی بھائی میرزا عزیز کوکا ان کی روحانی قدرت کے ستایش گر تھے۔

شیخ وجیہ الدین کے ایک مرید بنگال کے شیخ یوسف بھی تھے۔ مذہبیات کی اعلیٰ تعلیمات کے لیے وہ احمد آباد آئے اور یہاں شیخ وجیہ الدین کے ارادت مند ہو گئے۔

شیخ محمد غوث کے برگزیدہ خلفاء میں شیخ جیوہ عبدالحی بھی تھے۔ وہ اپنے عقیدت مندوں سے تحایف قبول نہیں کرتے تھے۔ ان سے ملاقات چاہنے والوں کا ہجوم جب ان کے ذکر و فکر کے عمل میں مزاحمت کا موجب ہونے لگا تو انھوں نے سفر و سیاحت اختیار کیا۔ پہلے وہ دہلی آئے اور پھر پانی پت کا سفر کیا۔ اور آخر کار جمنا کے ساحل پر واقع بدولی چلے آئے اور اسی جگہ ان کا انتقال ہوا۔

شیخ ودود اللہ شطاری شیخ معروف صدیقی کے فرزند بڑی درویشانہ طبیعت کے صوفی تھے۔ انھوں نے بارہ سال تک شیخ محمد غوث سے ذکر کے رموز و اسرار اور دعوت اسماء کے قواعد کی تعلیم حاصل کی۔ جب ان کے مرشد گجرات چلے گئے تو وہ مالوا کے ایک گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اکبر نے جب مالوہ کو ۹۶۸ھ میں فتح کر لیا تو شیخ کے

افغانی مریدان جو وہاں مقیم تھے منتشر ہوگئے اور وہ خود خاندیش چلے گئے۔ جہاں ۹۹۳ھ میں سو برس سے زیادہ کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ شیخ احمد متوکلی بھی شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے وہ ہندوستان کے مشرقی خطّے سے آئے تھے۔ شیر شاہ کی حکومت کے زمانے میں وہ اجین میں گوشہ نشین تھے۔ ان کا انتقال ۹۹۸ھ میں ہوا۔

چمپانیر کے شیخ نور محمد جو شیخ محمد غوث کے مرید تھے وہ گجرات کے سنی بوہرہ تاجروں کے فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ محمد غوث سے مرید ہونے کے پہلے شیخ نور محمد نے اپنی تمام دولت فقیروں کے درمیان تقسیم کردی۔ ان کے مرشد شیخ غوث محمد، نور محمد کے اس جود و جوانمردی کے عمل سے اس درجہ مسرور ہوئے کہ انھیں اپنے حلقۂ ارادت میں لینے کے بعد اپنا خلیفہ بنا دیا۔ نور محمد کا انتقال احمد آباد میں ہوا۔

شیخ شمس الدین زندہ دل متوفی ۹۹۰ھ شیراز کے رہنے والے تھے۔ بہت سارے مقامات کی سیاحت کے بعد وہ شیخ غوث محمد کے مرید ہوگئے۔ باطنی تعلیمات کی تکمیل کے بعد شیخ نے انھیں دکن میں شطاریہ تعلیمات کی ترویج کے لیے روانہ کیا۔ اکثر وہ دکن سے گوالیار کا سفر کرتے تھے اور مانڈو جو راستے میں پڑتا تھا وہاں پہنچ کر شیخ سے ملاقات کرتے تھے۔

شیخ محمد صدر الدین ذاکر چمپانیر میں متولد ہوئے۔ ان کے والد تاجر تھے۔ پچیس سال کی عمر میں شیخ ذاکر دنیا سے کنارہ کش ہوگئے۔ وہاں اپنے پیر کی رہنمائی میں ذکر اور ''اسمائے دعوت'' کے ورد میں مشغول رہے۔ پھر شیخ محمد غوث نے انھیں گجرات جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ بار ہا شیخ سے ملاقات کے لیے گوالیار آئے اور مانڈو کا بھی سفر کیا۔ غوثی شطاری کے قول کے مطابق گجرات میں صدر الدین ذاکر کے بہت سے خلفاء تھے جن میں بڑودہ کے شیخ صدیق بھی تھے۔ ان کی وفات ۹۹۶ھ میں بڑودہ میں ہوئی۔

شیخ عبداللہ صوفی شطاری شیخ وجیہ الدین اور شیخ محمد غوث، دونوں کے مرید تھے

جو لکھنؤ کے نزدیک سندیلہ کے رہنے والے تھے۔ان کا تولد ۱۲؍ربیع الثانی ۹۲۴ھ میں ہوا تھا۔اپنی ابتدائی تعلیم انھوں نے بدایوں میں حاصل کی۔ بدایوں سے دہلی گئے۔ پھر وہاں سے گجرات چلے گئے۔ وہاں انھوں نے متعدد عالموں بشمول شیخ وجیہ الدین سے تعلیم حاصل کی اور ''فصوص الحکم'' کا درس انھوں نے مولانا لطف اللہ رومی سے لیا۔طریقت کی راہ اختیار کرنے کے بعد وہ شیخ محمد غوث کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور دس سال تک وہ اپنے پیر کے دوسرے ارادت مندوں کی تربیت کرتے رہے۔انھوں نے حج بیت اللہ کے لیے مکہ کا سفر کیا اور پانچ سال تک مدینہ میں مقیم رہے۔احمد آباد لوٹ کر پندرہ سال تک وہاں زندگی گزاری۔ ۹۸۳ھ میں وہ آگرہ چلے گئے۔ یہاں ان کی وفات ۲۳؍جمادی الاول ۱۰۰۲ھ میں ہوئی۔ اپنے زمانۂ حیات میں شیخ عبداللہ صوفی شطاری نے متعدد کتابیں لکھیں۔غوثی شطاری نے جو ان کی تصنیفات کے نام بتائے ہیں وہ بقرار ذیل ہیں:

سراج السالکین، اوراد صوفیا، رسالۂ صوفیا، انیس المسافرین، اسرار الدعوات، شرح رسالۂ غوثیہ، رسالۂ کنز الاسرار، حال اشغال شطار یہ ساری تصنیفات شیخ محمد غوث کی کتابوں کی شروح وتفاسیر ہیں۔اور یہ شیخ کی بنیادی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کے لیے لکھی گئی ہیں۔

بہار کے عہد پیشینہ کی تاریخ کا ایک منظر

سرزمین ہند میں صوبہ بہار دو عظیم مذہب - بودھ مت اور جین دھرم کی بنیاد و ارتقا کا مرکز رہا ہے۔ ہندو مت سے قطع نظر ان دونوں ادیان میں کچھ ایسے عقاید شامل ہیں جو اسلامی تصوف و عرفان سے مماثلت رکھتے ہیں۔ وقت سیّار جب تاریخ ہند کو عہد عتیق کے اساطیری ماحول اور نامعتبر افسانہ و افسون کے تیرہ و تار مراحل سے نکال کر ۳۲۰ ق م کے قریب پہنچاتا ہے تو اس وقت صوبہ بہار میں چندر گپت موریا اورنگ نشین تھا جس کا پوتا اشوک ایک رفیع المرتبت بادشاہ کے طور پر تاریخ میں شہرت رکھتا ہے۔ اس نے پاٹلی پتر (پٹنہ) کو اپنی وسیع و عریض سلطنت کا پایہ تخت بنایا تھا۔ مگدھ کی یہ ریاست آٹھویں صدی عیسوی میں بہار کے نام سے موسوم ہوئی۔ ۳۲۰ ق م میں ریاست مگدھ کے احوال و آثار ہندوستان کے باستانی عہد کے مذہبی صحائف میں موجود ہیں۔ یہ موریہ خاندان کے آغاز کا زمانہ ہے۔ اور مگدھ کا دارالسلطنت پاٹلی پتر اس عہد میں سارے ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔ اس زمانے میں حکومت مگدھ سے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ موریہ خاندان کے انحلال کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو برسوں تک مگدھ میں سونگا اور کانوا خاندانوں کے راجاؤں کی فرماں روائی رہی اور اس کے بعد صوبہ بہار تین صدیوں تک مختلف خطوں کے حملہ آور حکمرانوں کے تحت تصرف رہا۔ اس عرصے کے تاریخی واقعات معرض گمشدگی میں جا پڑے ہیں۔ اور جو دستیاب ہیں وہ نہایت مشکوک، منتشر اور آشفتہ ہیں۔ تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں مگدھ میں گپتا خانوادے کی سلطنت کی بنیاد

پڑی۔ اس سلسلے کا ایک فرماں روا سمدر گپت غیر معمولی شخصیت اور عدیم المثال شوکت و شہامت کا مالک تھا۔ اس کے زمانے میں ایالت بہار نے اپنی دیرینہ حیثیت و اہمیت کو دوبارہ حاصل کیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب بہار میں چین کے سیاحوں کی آمد ورفت شروع ہوئی۔ فاہیان اور ہوان چوانگ کا ورود اسی عہد میں ہوا۔ گپتا خاندان کی بالا دستی کے زمانے میں مگدھ میں نالندہ یونیورسٹی کی تاسیس ہوئی جو بودھ مت کی تعلیمات کے لیے ہندوچین کے علاوہ جنوب مشرقی ممالک کے لیے مثلاً جاپان، ملیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ نہایت مہم ومعتبر مرکز تھی۔ گپتا خاندان کی فرماں روائی مگدھ میں آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک رہی۔ مگدھ میں مسلمانوں کے ورود سے قبل بیشتر ادوار میں طوائف الملوکی کی صورت رہی ہے۔ حضرت مسیح سے قبل مگدھ کے جن حکمرانوں کے نام مذہبی صحیفوں اور تاریخی کتابوں میں منضبط ہوئے ہیں ان میں راجا چراسنڈ، راجہ سیس ناگ ۶۴۲ ق م، راجہ بھیم بسار ۵۸۲-۵۵۳ ق م، راجہ اجات ستر و ۵۵۶ ق م-۵۵۴ ق م، راجہ درسکا ۵۲۷ ق م، راجہ اودے ۵۰۳ ق م-۴۵۹ ق م وغیرہ ہیں۔ لیکن قبل مسیحی واقعات مغشوش وغیر واضح ہیں۔ یہ مشتملات تاریخی اعتبار سے محکم ومستند نہیں ہیں۔

بہر حال بہار کے اطراف واکناف میں مسلمانوں کے ورود کی شروعات محمد بن بختیار خلجی کی عسکری ظفر مندیوں سے ہوتی ہے۔ اگر چہ کچھ ایسے بھی شواہد ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن بختیار خلجی سے پیشتر مسلمان بہار میں وارد ہو کر اپنی قدرت و غالبیت کے دائرے کی توسیع کر رہے تھے۔ مثلاً محمود غزنوی کی وفات سے چند سال قبل سالار مسعود غازی نے جو سلطان محمود کے خویشاوندوں میں تھا، ہندوستان کے مشرقی حصہ پر لشکر آرائی کی تھی۔ مسعود نے یہاں اکثر راجاؤں کو منہزم کر کے ان کی متحدہ طاقت کو توڑ دیا تھا۔ مسعود سالار غازی کی یورشوں کے نشانات قصبہ منیر میں بھی ملتے ہیں جہاں غازی پور، مانک پور کٹرہ کے مانند گنج شہیداں موجود ہے اور اس واقعہ کی یاد میں ہر سال میلے لگتے ہیں۔

خانقاہ منیر میں محفوظ سفینوں اور دیگر معتبر خطّی مأخذوں سے یہ حقیقت مستنبط ہوتی ہے کہ حضرت تاج فقیہ اور قطب سالار نے ۵۷۶ھ مطابق ۱۱۷۸ء میں راجا منیر کو شکست و ہزیمت سے دوچار کر کے علاقۂ منیر کو اپنے تحت تصرف کر لیا تھا۔ حضرت تاج فقیہ کی جنگی معرکہ آرائی اور اس میں ان کی متہورانہ پیروزی ایک مصدقہ تاریخی واقعہ ہے۔ موصوف حضرت مخدوم یحییٰ منیری پدر شرف الدین احمد منیری کے جد تھے۔ حضرت تاج فقیہ کا وطن فلسطین کا ایک مشہور قصبہ ہبرون تھا۔ وہ منیر کے ایک مسلمان باشندہ موسوم بہ مومن عارف جو راجا منیر کے جور و اذیت کا ہدف بنے ہوئے تھے، لاجرم بے بسی و بیچارگی کے عالم میں فلسطین کی مسافرت اختیار کی اور اپنی مظلومی وستم دیدگی کی دادخواہی کے لیے حضرت تاج فقیہ سے فریاد کی۔ حضرت نے اس فریادی کے دردناک واندوہبار احوال کو سن کر تڑپ اٹھے اور بلا تاخیر ایک لشکر جرار کو ساتھ لے کر ہندوستان کا رخ کیا اور منیر پہنچ کر وہاں کے راجا کو شکست خوردہ ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن نواحِ بہار و بنگال میں اولین شخص جس نے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی بختیار خلجی تھا۔ بختیار خلجی جو سرزمین غور کا ایک مقتدر و معزز باشندہ تھا، جاہ و منصب کی تلاش میں وہ سب سے پہلے غزنی میں شہاب الدین غوری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر ہندوستان کا سفر کیا اور بدایوں پہنچ کر سپہ سالار ہزبرالدین ارنب سے قریب ہوا۔ لیکن اپنے بلند تر مقصد و مرام کے سبب وہ اپنی واقعی حیثیت سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ کچھ مدت کے بعد اودھ کے لیے عازم سفر ہوا اور وہاں پہنچ کر حسام الدین اغلبک کے ملازموں کی ردیف میں شامل ہوا۔ یہاں حسام الدین اغلبک سے وابستہ رہتے ہوئے وہ اپنا اثر و نفوذ بڑھاتا رہا اور ایک مختصر مدت میں اس نے ایک معتنا بہ مقدار میں آلات جنگی فراہم کر لیے۔ سلطان معز الدین محمد غوری نے اسے مرزاپور کے علاقے میں کچھ مواضع بھی عطا کیے تھے۔ اس علاقے میں اپنی قدرت و حیثیت کو استوار کر کے مشرقی علاقوں پر یلغار کرتا رہا۔ آخر کار سلطان قطب الدین ایبک کے حضور میں پہنچا تو سلطان اس کی محیر العقول جرأت و عزم، فوجی تدبیر و ہوشیاری سے بے حد متاثر ہوا اور اسے نہایت خطیر انعامات سے سرفراز کیا۔

بختیار خلجی بلا شبہ ہمت وحوصلہ رکھنے والا فوجی سردار تھا۔ فتح بہار کی مہم کو بخو احسن انجام دینے کے بعد وہ ایک جسور و جانباز سرباز وں کے ایک لشکر کے ساتھ ندیا (بنگال) پر حملہ آور ہوا۔ اور وہاں سین خاندان کے راجا لکھمن سین کو مغلوب کر کے ایالت بنگال کو اپنے اختیار میں لے لیا اور شہر لکھنوتی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ بہار و بنگال کے تو اں فرسا اور صبر آزما مہمات کو سر کر لینے کے بعد محمد بن بختیار نے کوچ بہار کے راستے سے تبت پر لشکر کشی کی لیکن اس مہم میں راستے کی دشواریوں اور انتظامی امور میں نقص و نادرستی کے سبب بختیار خلجی کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کو اس نامسعود جنگی سفر میں ضائع کرنے کے بعد وہ بے نیل مرام لوٹ گیا۔ القصہ اس ناکام مہم کے رنج وغم کے زیر اثر ۶۰۲ھ میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بختیار خلجی کی شخصیت نہایت پر ہیبت، بانفوذ اور شکوہمند تھی۔ اس نے اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مشرقی ایالات پر پے در پے حملے کیے اور اس دیار میں مسلمانوں کے اثر و نفوذ اور رعب و دبدبہ کو استوار کیا۔ بختیار خلجی کی وفات کے بعد بہار و بنگال کی ریاستیں جن خلجی سرداروں کے ماتحت رہیں ان میں عز الدین محمد شیران ۶۰۲ سے ۶۰۵ھ تک، قائماز رومی ۶۰۴ھ سے ۶۰۵ تک، علی مردان خلجی ۶۰۵ سے ۶۰۸ھ تک، سلطان غیاث الدین ۶۰۸ھ سے ۶۲۴ھ تک، علاء الدین جانی ۱۲ھ اور ناصر الدین بن التمش جس نے صرف دو سال بہار و بنگال پر حکومت کی۔ ان کے نام طبقات ناصری اور دوسری تاریخی کتابوں میں آئے ہیں۔

☆☆☆

مشائخ فردوسیہ کے احوال وآثار پر ایک نظر

حضرت نجم الدین کبریٰ:

احمد بن عمر الصوفی المخاطب بہ خواجہ نجم الدین کبریٰ کا تولد خوارزم میں ۵۴۰ھ میں ہوا تھا۔نوجوانی کے ایام میں وہ حدیث کا درس لینے کے لیے خوارزم سے ہمدان گئے۔ پھراس کے بعد تحصیل علوم کے لیے انھوں نے اسکندریہ اور تبریز کا بھی سفر کیا تھا۔ انھوں نے خوزستان کا سفر کیا اور وہاں شیخ اسماعیل قصری متوفی ۵۸۹ھ کے دست پرُ مرحمت پرارادت کا پیمان باندھا۔حضرت نجم الدین کبریٰ اپنے مرشد کی ہدایت پر شیخ عمار ابن یاسر متوفی ۵۹۷ھ شیخ ابونجیب سہروردی کے رفیق تھے کے مریدوں کے حلقہ میں داخل ہوئے اوران کی ہدایت پر مصر گئے اور شیخ روزبہان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی دختر کو اپنی زوجیت میں لیا۔

شیخ اوحدی نے جو اس دور کے معروف صوفی شاعر تھے ان کی منقبت لکھی ہے جس سے ان کے فضل وکمال اور صوفیانہ عظمت پر روشنی پڑتی ہے۔چند اشعار بقرار ذیل ہیں:

یارب بہ ولی تراش مطلق	آن نجم و نجوم ملت و حق
یارب بہ مقام آن مقدم	پیر کبریٰ کبیر عالم
یارب بہ کمال پیر خوارزم	آن وارث ہمہٗ اولوالعزم
یارب بہ کمال بخش بی رنج	واصل کن مجددین بہ شطرنج
یارب بہ وفور نکتہ دانیش	از تبصرہ منکشف معانیش
یارب بہ بیان بی مقالات	بی نطق جواب محو و اثبات

یارب بہ سکون رہنمو نی / با دعوی صاحب سلونی
یارب بہ ولی تراشیؑ او / خاصیت فیض پاشیؑ او
یارب بہ صباح فیض پاشی / از سگ بہ نظر ولی تراشی

''خزینۃ الاصفیاء'' کے مصنف غلام سرور خواجہ نجم الدین کے اسم گرامی کے ساتھ 'کبریٰ' کے اضافہ کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ موصوف نہایت ذہین طالب علم تھے اور مناظرہ ومباحثہ میں ہمیشہ اپنے حریف کو شکست دیتے تھے۔ لہٰذا احباب نے ان کو طامۃ الکبریٰ کا لقب دے دیا تھا۔ گذشتِ زمان سے 'طامہ' لوگوں کے حافظہ سے نکل گیا۔ مخدوم شعیب فردوسی اپنے تذکرہ ''مناقب الاصفیا'' میں خواجہ نجم الدین کے فضل وکمال اور روحانی عظمت وجلال کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''سخن در توحید ومعرفت و در قواعد طریقت وحقیقت بہ بیانی بدیع گفتہ، تصنیفات او بہ عربی و فارسی ونظم بسیار است۔ از جملہ تصنیفات او تبصرہ و رسالہ، در بیان طریق سلوک در این زمین ہند مشہور است۔''

خواجہ نجم الدین کے کچھ اشعار جن میں تصوف کے نکات بیان ہوئے ہیں درج ذیل ہیں:

در محیطی فکندہ ام زورق / کہ دو عالم از وست مستغرق
نتوان زورق از محیط شناخت / بہ وجود محیط از زورق
آب شد زورق ز شیر آلود / این است معنی مشکل و مغلق
بہ حقیقت بہ بین کہ اصل وجود / نہ شود مختلف زہیچ نسق
کفر و ایماں و سنت و بدعت / اصطلاحیست درمیان فرق
حق پرستی و ما ومن گفتن / راہ گم کردۂ زہی احمق
ما و حق لفظ احمق ست بہم / چو زما بگذری بہ ماند حق

حضرت نجم الدین کبریٰ کی غزلوں میں صادقانہ عشق کی سرمستی وشورانگیزی ہے۔ سپردگی اورازخودرفتگی کی کیفیت ہے۔ کچھ غزلوں کے اشعار مثالاً نقل کیے جاتے ہیں:

گم شدم در خود ندانم باکیم یاچیستم — قالبم عقلم حیاتم جان گویا چیستم
آدمی نامم ولیکن آدمی دراصل چیست — معنیم یا صورتم اسم مسمیٰ چیستم
درچنین حیرت کہ من دارم چہ گویم وصف خویش — آتشم خاکم نسیم آب و دریا چیستم
عاقلم دیوانہ ام اندر فراقم یا وصال — نیستم ہستم نہ برجایم نہ بیجا چیستم
گاہ رند وگاہ زاہد گاہ مست وگہ خموش — ساقیم یا بادہ ام یاجام صہبا چیستم

بہ عشق اندر گرفتارم نہ ہوشیارم نہ دیوانہ — نہ دلدارم نہ دل دارم نہ جان دارم نہ جانانہ
نہ از علوی خبردارم نہ از سفلی اثر دارم — وطن جای دگر دارم کہ اینجا نیست وآنجانہ
نہ در کنج مناجاتم نہ درکوی خراباتم — خلاف عقل طاماتم کشیدہ رطل مستانہ
الا ای نجم گر خواھی مسلم ماہ تاماہی — بسوی حضرت شاہی قدم بردار مردانہ

حضرت نجم الدین کبریٰ مختلف ملکوں کی مسافرت کے بعد خوارزم میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ ان کے مریدوں کی تعداد کثیر ہے جن میں مجد الدین بغدادی، سعدالدین حموی، نجم الدین دایہ مصنف مرصاد العباد، اور سیف الدین باخرزی زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ نجم الدین کبریٰ کو تین بزرگوں سے ارادت کی سعادت حاصل تھی۔ وہ تھے حضرت اسمٰعیل قصری، شیخ عمار بن یاسر اور شیخ ابوالنجیب سہروردی۔ تین بزرگوں کی ارادت کی وجہ سے شیخ نجم الدین کو ''سہ سر تراش'' کہتے ہیں۔ سر کے بال تراشنا ارادت کی ایک رسم ہے جسے مرشد انجام دیتا ہے۔

حضرت نجم الدین کبریٰ ''ولی تراش'' بھی کہے جاتے ہیں۔ یادحق تعالیٰ میں وہ اس درجہ منہمک ومستغرق رہتے تھے اور اوراد و وظائف میں اس طرح متصلاً مشغول رہتے تھے کہ جس پر بھی ان کے لطف وکرم کی نگاہ پڑتی تھی وہ ولی ہوجاتا تھا۔

۶۱۸ھ میں چنگیز خاں نے خوارزم پر حملہ کیا۔ شیخ کبریٰ بھی مغلوں کے تیروں کا نشانہ بنے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔ شہادت کے وقت حضرت کبریٰ کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ جامیؔ نے حضرت کبریٰ کی شہادت کے واقعہ کو بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ بقرار ذیل ہے:

جب تاتاریوں کا لشکر خوارزم پہنچا تو شیخ کبریٰ نے اپنے تمام مریدوں کو جمع کیا جو ساٹھ سے کچھ زیادہ کی تعداد میں تھے۔ سلطان محمد خوارزم شہر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ لیکن تاتاریوں کو گمان تھا کہ سلطان وہاں موجود ہے۔ مغلوں کی فوج آگے بڑھ رہی تھی۔ شیخ نے اپنے کچھ رفیقوں کو بلایا اور کہا تم سب اپنے اپنے ملکوں کو لوٹ جاؤ۔ لیکن شیخ کو ان کے مرید تنہا چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ شیخ نے ان سے کہا کہ وہ اس جگہ ہی شہید ہو کر وفات پائیں گے اور ان کا وہاں سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے۔ آخر ان کا فیصلہ سن کر ان کے تمام مریدین خراسان کی طرف کوچ کر گئے۔

جب وحشی مغلوں کا ہجوم شہر میں داخل ہوا تو شیخ نے اپنے ان چند مریدوں کو جو ان کے ساتھ رہ گئے تھے سے کہا کہ تیار ہو جاؤ اور خدا کے نام پر دشمنوں سے جنگ کرو اور خود گھر کے اندر گئے، اپنا خرقہ پہنا اور خرقہ کے دونوں طرف پتھر کے ٹکڑے رکھ لیے اور سنان لے کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے باہر نکل آئے اور تا دمِ آخر دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

نجم الدین کبریٰ معروف صوفیوں کے اس قول کو اپنے دوستوں، عزیزوں اور مریدوں کے درمیان اکثر نقل کرتے تھے کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے اس کی مخلوق کے انفاس کی تعداد کی طرح بے حد و حساب ہیں۔ ان کی تصنیف ''اصول العشرہ'' عربی زبان میں ہے جو تصوف کے دس رہنما اصول پر مبنی ہے جو اس طرح ہیں: توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت، ذکر کی پابندی، حق تعالیٰ کی جانب ارتکاز، صبر، مراقبہ اور رضا۔ ''صفات الادب'' فارسی زبان میں لکھی گئی ہے جس میں مبتدی صوفیوں کو ہدایتیں دی گئی

ہیں۔ ''منہاج السالکین'' عربی زبان میں ہے۔ یہ تصوف کے موضوع پر اونچے معیار کی کتاب ہے۔

حضرت نجم الدین کبریٰ سماع کے مخالف تھے لیکن شیخ اسمٰعیل قصری کے حلقہ ارادت میں آنے کے بعد وہ سماع کے شائق ہوگئے۔ اور جہاد اکبر اور جہاد اصغر دونوں میں ان کے کارنامے درخورِ تقلید تھے۔ ساری زندگی ریاضت ومجاہدۂ نفس میں گزاری اور اپنی حیات کے آخری دن میں وہ چنگیزی لشکر سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

تصوف کے دس رہنما اصول جن کا ذکر انھوں نے اپنی تصنیف 'اصول العشرہ' میں کیا ہے ان کی توضیحات یہاں بیان کی جاتی ہیں۔ پہلا توبہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ طالب حق تعالیٰ کو دنیا وآخرت کے مراتب سے جو حجاب ہیں اُن سے باہر ہو جانا چاہئے۔ ایسی صورت میں گناہوں کے ارتکاب کی رغبت زائل ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ زہد کا ہے یعنی سالک کو چاہئے کہ وہ اسباب دنیوی، جاہ وحشمت، مال ومتاع سے یکسر کنارہ کش ہو جائے۔ تیسرا اصول توکل، کا ہے یعنی حق تعالیٰ پر یقین رکھنا چاہئے اور معاشی و دنیاوی خوشبختی کے اسباب ووسائل کو خدا پر چھوڑ دینا چاہئے۔ چوتھا اصول قناعت کا ہے یعنی سالک کو تمام خواہشات نفسانی سے جدا ہو جانا چاہئے۔ پانچواں عزلت کا اصول ہے یعنی سالک طریقت کو لوگوں سے غیر متعلق ہو جانا چاہئے۔ عزلت نشینی یہ ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر دنیاوی باتوں سے الگ ہو جائے۔ چھٹا اصول ذکر کی پابندی ہے یعنی سب باتوں کو بھول کر خدا کو یاد رکھنا۔ ساتواں طریقہ یہ ہے کہ خدا کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائے۔ آٹھواں طریقہ صبر کا ہے یعنی مجاہدہ وریاضت کی کثرت سے تمایلات نفسانی پر اختیار حاصل کرنا اور اپنے تمام اوصاف واحوال سے بیزار رہو کر اس کی ملاقات کا مشتاق ہونا۔ دسواں اصول رضا کا ہے یعنی اپنے نفس کی خوشی کو چھوڑ کر خدا کی خوشنودی اور رضامندی کا طالب ہونا۔

حضرت سیف الدین باخرزی:

سیف الدین باخرزی حضرت نجم الدین کبریٰ کے مریدوں میں تھے۔ ان کا مشائخ عظام میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے سلاسل کے صوفیا بھی ان کی عظمت و جلالت کا اعتراف کرتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء، قطب الدین بختیار کاکی، شیخ شہاب الدین سہروردی جیسے مشائخ کبار نے بڑے احترام واکرام کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی زندگی کا ایک نہایت وقیع کارنامہ یہ رہا ہے کہ چنگیز کا پوتا خدابندہ ان کے دست پر میمنت پر مشرف بہ اسلام ہوا اور پھر اس کی تقلید میں بہت سارے اعیان سلطنت، منصبداران حکومت اور سرداران لشکر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حضرت سیف الدین باخرزی کے مرید ہونے کے واقعہ کو مناقب الاصفیا کے مصنف اور چند دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی بیان کیا ہے۔ واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ سیف الدین باخرزی ابتدا میں بڑے مقبول واعظ تھے۔ نہایت مؤثر و پرجوش خطیب تھے۔ احکام وآداب تربیت کی باتوں کو بڑے جوش وجذبہ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ لیکن انھیں طبقۂ صوفیا پر یقین نہیں تھا اور اکثر اپنی سخن رانیوں میں اس طائفہ کو مورد شنعت قرار دیتے تھے۔ نجم الدین کبریٰ کو جب باخرزی کے اس رویہ کی خبر ہوئی تو ایک بار حضرت نجم الدین کبریٰ ان کی مجلس وعظ میں شریک ہوئے۔ باخرزی نے جب نجم الدین کبریٰ کو اپنی مجلس میں شریک دیکھا تو مزید شدت کے ساتھ لعن طعن کرنے لگے۔ لیکن حضرت نجم الدین کبریٰ بڑی استواری و بردباری کے ساتھ باخرزی کے کلمات پر صدائے تحسین وآفرین بلند کرتے رہے۔ جب تشنیع وسرزنش سے بھری ہوئی باخرزی کی تقریر ختم ہوئی تو حضرت نجم الدین کبریٰ باہر نکلے۔ لیکن اس عرصے میں سیف الدین باخرزی کا قلب ماہیئت ہو چکا تھا۔ شیخ ولی تراش نے ان کی دنیا میں تغیر پیدا کر دیا تھا۔ وہ وارفتہ وبے اختیار ہو کر حضرت کبریٰ کے قدموں پر جا گرے۔

'مناقب الاصفیا' 'دلیل العارفین' ملفوظ خواجہ معین الدین چشتی 'خیر المجالس' برہان الاتقیا اور دیگر منابع میں حضرت سیف الدین باخرزی کے بہت سے واقعات مذکور ہوئے ہیں جن سے اُن کی علمی و روحانی قدر و مرتبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت باخرزی کی وفات ۷۳ سال کی عمر میں ۶۵۸ھ میں ہوئی۔ موصوف کا مرقد اقدس بخارا میں ہے۔

حضرت سیف الدین باخرزی ایک عالی مقدار صوفی ہونے کے باوصف ایک مستند شاعر بھی تھے۔ اگرچہ ان کے اشعار کا کوئی دیوان موجود نہیں ہے لیکن ان کی رباعیات کا ایک مجموعہ کتابخانۂ خدابخش پٹنہ میں محفوظ ہے۔ ان رباعیات سے فنِ شعر گوئی میں ان کی فکری و ہنری لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔ تاریخ گزیدہ کے مصنف نے ان کی رباعیوں کو ''سخنان شورانگیز'' کہا ہے۔ کچھ رباعیاں مثالاً ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

ای سرّ تو در سینۂ ہر صاحب راز پیوستہ در رحمت تو برہمہ باز
ہرکس کہ بدرگاہ تو آید بہ نیاز محروم ز درگاہ تو کی گردد باز

☆☆

با عشق تو عہد جان ما مشتاقیست تا بیم و غم عشق تو باجان باقیست
غم نقل ندیم درد و مطرب نالہ می خون جگر و چشم ساقی ست

☆☆

سبحان اللہ شگرف کاری غم تو برختہ دلم عقلیم باری غم تو
گفتی کہ غم منت چنین مجنون کرد آری غم تو غم تو آری غم تو

☆☆

از دیدۂ سنگ خون چکاند غم تو بیگانہ و آشنا چہ داند غم تو
دم درکشم و ہمہ غمت نوش کنم تا از پس من بکس نماند غم تو

☆☆

ای دل چہ بود کہ ترک بیداد کنی از منزل آخرت یکی یاد کنی
گر نامۂ اعمال ترا بنمایند بینی و ہزار آہ و فریاد کنی

☆☆

ای دل تو دمی مطیع سبحان نشدی　　از خوی بدت ہیچ پشیمان نشدی
درویش شدی و زاہد و دانشمند　　این جملہ شدی ولی مسلمان نشدی

☆☆

فسق است وفساد در دہر روزۂ ما　　پرشد ز حرام کاسہ و کوزۂ ما
می خندد روزگار می گرید عمر　　بر طاعت و بر نماز و بر روزۂ ما

☆☆

عمر بسر آمد وگنہ می بینم　　سر تا سر نامہ را سیہ می بینم
در مزرعہ خود نکشتہ ام تخم نکو　　کشتم بدرو رسید و می بینم

☆☆

بی علم وعمل بہشت یزدان مطلب　　بی خاتم دین ملک سلیمان مطلب
چون عاقبت کار فنا خواہد بود　　آزارِ دل ہیچ مسلمان مطلب

☆☆

دنیا گذرانست بہر بیش و کمی　　خواہش بہ شادی گذران خواہ غمی
زین منزلت البتہ می باید رفت　　خواہی بہ ہزار سال وخواہی بہ دمی

باخرزی کی رباعیات کے اختصاصی عناصر میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے اس کی زبان سادہ وسہل ہے اوراس کے شیوۂ بیان میں ژولیدگی نہیں ہے۔ بیشتر رباعیاں ایزدسبحان سے متعلق غم عشق کو بیان کرتی ہیں۔ کہتے ہیں:

غم نقل و ندیم درد ومطرب نالہ　　می خون جگر و چشم ساقی ست

عاشق صادق کے لیے متاعِ غم سب سے بڑی دولت ہے۔ وہ اس ثروتِ سرمدی کے مقابلے میں دونوں جہان کو پوچ و بے ارزش تصور کرتا ہے۔ خواجہ حافظ کے ایک شعر کا یہ مصرعہ بھی اسی خیال کی حمایت کرتا ہے ''دمی باغم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد''۔ باخرزی

عشق الٰہی کے غم کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کو مقصود حیات تصور کرتے ہیں۔ سعادت و برکت رکھنے والی اس موہبت کو لمحہ بھر بھی اپنے آپ سے جدا دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ اقبال لاہوری بھی دردِ دل کی قدر واہمیت کے بارے میں اس طرح سخن گو ہوتے ہیں:

یک ذرۂ درد دل از علم فلاطون بہ　　بر عقل فلک پیما ترکانہ شبیخون بہ

اشکی کہ فرو خوردی از بادۂ گلگون بہ　　دی مغبچہ ای با من اسرار محبت گفت

ایک اہم عنصر ان کی رباعیوں کا یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کے دوسرے سخنوروں کی طرح اپنی زنبیل میں اعمال خیر وسعادت رکھنے کے باوجود بھی ان کو بے وزن و بے اعتبار تصور کرتے ہیں اور نیکوکار رہنے کے باوجود خود کو گنہگار سمجھتے ہیں۔ اور کچھ رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں جہانِ گزران کی حقیقت کو عارفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انسان مسرت و نشاط میں زندگی بسر کرے یا غم روزگار میں چند دنوں کے لیے بقید حیات رہے یا ہزار سال تک زندہ رہے، انجام کار اسے اس سرائے فانی کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

خواجہ بدرالدین سمرقندی:

خواجہ بدرالدین سمرقندی حضرت سیف الدین باخرزی کے خلیفہ تھے اور سلسلۂ فردوسیہ کے پہلے برگزیدہ اور صاحب فضل وکمال صوفی ہیں جو اشاعت دین اور ابلاغ علوم باطنی کے لیے ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں سکونت پذیر ہو کر ترویج دین اور وابستگان کے تصفیہ باطن کے کاموں میں مشغول رہے۔ صاحب خبر ونظر صوفی تھے۔ ایک صاحب معرفت صوفی ہونے کے باوصف اپنے زمانہ کے ایک ممتاز عالم تھے اور تصوف کو خرافات اور خارق العادہ ناقابل اعتبار امور سے مبرا کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ کشف و کرامات کے اظہار کو درخور اہمیت تصور نہیں کرتے تھے اور مریدوں کو بڑی استواری سے علم دین کے حصول کی تلقین فرماتے تھے۔ حضرت بدرالدین سمرقندی کے ہمعصر بزرگوں میں شیخ بہاء الدین ذکریا، شیخ نجم الدین صغریٰ، خواجہ معین الدین چشتی اور خواجہ قطب الدین

بختیار کاکی وغیرہ تھے۔ جب ہندوستان میں حضرت بدرالدین سمرقندی کا ورود مسعود ہوا تھا اس وقت یہاں صوفیوں کے ذریعہ کشف وکرامات کا رویہ بہت زیادہ معمول ومروج تھا۔ خصوصاً حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو کرامات وخوارق کے اظہار میں بڑی دلچسپی تھی، لیکن حضرت بدرالدین سمرقندی اس عمل کو پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہاں کے عوام کے متوّہم ذہن کو بدلنا چاہتے تھے۔ وہ حقیقی بزرگی کے لیے کشف ویقین کو ضروری سمجھتے تھے اور کرامات کو روحانی بزرگی کا ثبوت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال درج ذیل ہے:

> ''اگر خدای تعالیٰ کرامت روزی کردہ باشد واگر کرامت روزی نکردہ باشد وکشف یقین شدہ باشد او بی نیاز است از کرامت۔ شیخی را کرامت امر لازم نیست اگر کرامت باشد باکشف ویقین نیکوست واگر کشف ویقین شدہ باشد وکرامت نباشد نیکوتر۔''

حضرت بدرالدین سمرقندی مجالس سماع میں زمان، مکان اور اخوان کی شرائط کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ جہان تصوف میں اپنی مخصوص اصلاح پسندانہ طرز وروش کی بنا پر ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ اپنی مساعی میں کچھ کامیاب بھی ہوئے۔ اور ضعیف الاعتقاد وتوہم پرست لوگوں کے ذہن ودل پر کرامات کا جو استیلا تھا اس میں ان کی مخلصانہ کوششوں سے واضح طور پر کمی آئی۔

خواجہ نجیب الدین فردوسی:

مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے پیر خواجہ نجیب الدین فردوسی، حضرت رکن الدین فردوسی کے خلیفہ تھے۔ رکن الدین فردوسی خواجہ نجیب الدین کے بھائی تھے۔ ان کے والد شیخ عمادالدین فردوسی نے ان کو تعلیم وتربیت کے لیے اپنے منجھلے

بیٹے رکن الدین فردوسی کے تحت نگہداشت کر دیا تھا۔ چنانچہ علوم ظاہری و باطنی انھوں نے اپنے بھائی کی خدمت میں حاصل کیے۔ مناقب الاصفیا کے مصنف نے حضرت نجیب الدین فردوسی کی تعریف ''سر حلقہ، مجردان، سرور مقربان، مجموع اہل صفا، سرچشمۂ مردان خدا'' جیسے کلمات سے کی ہے۔ اگر چہ وہ ایسے متواضع و فروتن صوفی تھے کہ وہ اپنی صوفیانہ مقام و مرتبت کا اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ شہرت سے گریز کرتے تھے۔ ان کی طبیعت کے اوصاف میں کم آمیزی تھی جس کے سبب وہ زیادہ لوگوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں نہیں لیتے تھے۔ 'اخبار الاخیار' میں مذکور ہے کہ جب حضرت مخدوم شرف الدین احمد حضرت نجیب الدین سے مرید ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ میں برسوں سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں تاکہ تمہاری امانت تمہارے سپرد کردوں اور فوراً بیعت لے لی اور اجازت نامہ ان کے حوالے کیا۔ حضرت کی تصنیفات کی بابت کچھ اطلاع نہیں ہے۔ بجز اس وصیت نامہ کے جو حضرت نجیب فردوسی نے مخدوم شرف الدین کو حلقۂ ارادت میں لینے کے بعد ان کے حوالے کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ حضرت نجیب الدین فردوسی کی وفات ۷۳۲ھ میں ایک سو اکیس برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ اس وصیت کا ایک مختصر اقتباس درج ذیل ہے:

> ''ای عزیز! در تربیت دلی بعد از تأمل و تفکر بسیار، روشن شدہ کہ مشغول شدن بہر چہ ھست باش گو خطا است جز مشغولی بہ ترک خود گرفتن۔ خودی عبارت است از جملہ حرکات و سکنات واقوال و افعال ہوای بشریت کہ از این کس در وجود آید حسب عادت و مقتضای ہوای بشریت از خوردن و خفتن و گفتن و مخالطت کردن و شنیدن و دیدن وغیر آن، مگر آنچہ از این جملہ بہ وقت ضرورت بقدر ضرورت باشد۔ اگر آن نکند از حق دور افتد۔ پس از آن اہم مہمات است کہ لیلاً و نہاراً در این تفکر باشد کہ از خودی ہنوز چہ ماندہ است۔ تا آنگاہ از خودی بفضل حق بکلی بیرون آید۔ از آنکہ سر موی از خود باقی ماند حجاب باقیست۔''

مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری:

حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری ایک عارف کامل ہونے کے ساتھ ایک جلیل القدر عالم بھی تھے۔ وہ ہندوستان میں سلسلۂ فردوسیہ کے مشائخ عظام کے درمیان اپنے ذہن وضمیر کی روشنی وفورِ عبادت وریاضت اور اپنی طبیعت کی مکرمت وسعادت کی بنا پر والاترین مقام کے حامل تھے۔ ان کا تولد ۲۹ رشعبان ۶۶۱ ھ میں منیر شریف (صوبہ بہار) میں ہوا تھا۔ وہ شیخ یحییٰ منیری کے فرزند اور مولانا محمد تاج فقیہ کے پرپوتے تھے۔ حضرت تاج فقیہ منیر کے مقامی غیر مسلموں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر کے ساتھ فلسطین سے آئے تھے۔ اس مہم میں ان کے فرزندان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جنگ میں حضرت تاج فقیہ کو فتح حاصل ہوئی۔ خود فلسطین لوٹ گئے لیکن اپنے فرزندوں کو تبلیغ دین مبین کے لیے منیر میں سکونت پذیر ہونے کا حکم دیا۔ منیر شریف کے اطراف واکناف اور بہار کے دوسرے علاقوں میں بھی حضرت تاج فقیہ کے فرزندوں کی مساعی سے اسلام کی تبلیغ واشاعت ہوئی۔

حضرت شرف الدین احمد نے ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد کی رہنمائی میں پڑھیں۔ سنِ شعور پر پہنچنے کے بعد ان کے والد نے انھیں اونچی تعلیمات کے حصول کے لیے حضرت ابوتوامہ کے ساتھ سنارگاؤں (بنگال) بھیج دیا۔ حضرت ابوتوامہ اپنے زمانہ کے ایک معروف عالم تھے۔ حضرت یحییٰ منیری ان کی علمی مرتبت سے واقف تھے۔ چنانچہ جملہ علوم متعارفہ دینی ودنیوی حضرت شرف الدین نے اپنے استاد سے سیکھے۔ وہ تحصیل علم کے زمانے میں بھی اوقاتِ شب میں ریاضت کش ہوتے تھے۔

وطن لوٹنے کے بعد تلاش حق کا ذوق وجذبہ اس درجہ ان پر غالب ہوا کہ کچھ ہی دنوں کے بعد اپنے مراد مقصود کے حصول کے لیے مرشد کی جستجو میں دہلی کے لیے عازم سفر ہوئے۔ اپنے بھائی جلیل الدین کے ہمراہ دہلی پہنچ کر وہاں کے صوفیوں اور سجادہ نشینوں سے ملاقات کی۔ اور حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور ان سے ہدایت وارشاد کی درخواست کی لیکن سلطان الاولیا نے اس درخواست

پر غور وفکر کرنے کے بعد انھیں باطنی تہذیب وتصفیہ کے لیے حضرت نجیب الدین سے وابستہ ہونے کا مشورہ دیا۔ حضرت نظام الدین کے ایما پر حضرت مخدوم شیخ نجیب الدین کے حضور میں حاضر ہوئے اور بلا تاخیر ان سے بیعت لے لی۔ مخدوم حضرت شرف الدین نے ان کی صحبتوں سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں کچھ دنوں تک رہنے کی اجازت چاہی لیکن شیخ نجیب الدین نے اجازت نہیں دی اور بیش قیمت نصیحتوں کے ساتھ وطن لوٹ جانے کی ہدایت کی۔ مرشد کے نصائح کا زبدہ وخلاصہ یہ تھا کہ سالک کو معاملات دنیوی میں زیادہ مشتغل نہیں ہونا چاہئے۔ راہروطریقت کے تمام طبیعی اعمال و حرکات مثلاً بولنا، سننا، دیکھنا، کھانا، پینا اور سونا وغیرہ حد اعتدال میں ہونے چاہئیں۔ مجاہدہ نفس پر ایسا عمل ہونا چاہئے کہ خودخواہی، خود پرستی کا کامل طور پر ازالہ ہوجائے۔ یاد الٰہی میں اس کا دل اس طرح مستغرق رہے کہ تمایلات دنیوی سے دایماً وہ محترز رہے۔ ریاضت ایسی ہو کہ بشری کمزوریوں پر غالب رہے۔ جسم وجان کی مکمل تطہیر کے لیے ہمیشہ باوضو رہے اور موسم سرما میں بھی جب شدید ٹھنڈ پڑ رہی ہو وضو سے صرف نظر نہ کرے۔ اسی طرح اور بھی اوقاتِ شب وروز گزارنے سے متعلق مرشد کی نصیحتیں تھیں۔

بہر حال حضرت مخدوم نے وصیتوں کی اس تحریر کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر وطن کے لیے روانہ ہوئے۔ اثنائے سفر میں انھوں نے مرشد کی وفات کی خبر سنی لیکن مرشد کی پہلے سے دی ہوئی ہدایت کے مطابق وہ ان کی عزاداری کے لیے نہیں لوٹے۔ اور سفر معاودت پر آگے بڑھتے رہے، اور جب آرہ کے نزدیک جنگلوں سے گزر رہے تھے تو ان پر جذب وجنوں کی کیفیت طاری ہوئی اور جنگل میں غائب ہوگئے۔ مناقب الاصفیا کے مصنف کے قول کے مطابق حضرت مخدوم بہیا کے جنگل میں بارہ سال تک ریاضت کش رہے اور اس کے بعد راجگیر کی پہاڑیوں میں مجاہدہ نفس کرتے رہے۔ ان ایام میں ہندو مرتاضوں سے ان کا روحانی مقابلہ بھی ہوا۔ اور ان روحانی مبارزات میں ہندو مرتاضوں کو شکست ہوئی تھی جس کے نتیجے میں وہ حضرت

مخدوم کے دست پر میمنت پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جب طویل مدت کی ریاضتوں سے ان کا باطن منور ہو گیا تو وہ معاشرے سے قریب ہونے لگے اور نماز جمعہ میں شریک ہونے کے لیے بہار شریف آنے لگے اور کچھ دنوں کے بعد وہاں اقامت گزیں بھی ہو گئے۔ بہار شریف مقیم ہو کر تادم حیات انوار باطنی اور علوم دین وشریعت سے خاص و عام کو مستفیض کرتے رہے۔

حضرت مخدوم الملک کی بزرگی اور غیر معمولی باطنی کمالات کی اطلاع سلطان محمد تغلق کو ہوئی تو اس نے مخدوم کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرانے کا فرمان جاری کیا اور مخارج خانقاہ کی کفالت کے لیے راجگیر کے علاقے میں جاگیریں ہدیۃً دیں جن کو حضرت مخدوم نے جبر وکراہت کے ساتھ قبول کیا۔ خانقاہ کی تعمیر سے تبلیغ واشاعت دین اور لوگوں کے قلوب کی تطہیر وتزکیہ میں بڑی مدد ملی لیکن جاگیروں کے بار گراں سے وہ فکر مند رہتے تھے۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق جب اورنگ نشین ہوا تو خود دہلی جا کر قبالۂ جاگیر کو واپس کر دیا۔ بہار شریف لوٹ کر ارشاد وہدایت کے کام میں مشغول ہو گئے اور کتبی وشفاہی دونوں طور پر عقیدت مندوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کے ارشاد وہدایت کے گرانمایہ کلمات مکتوبات وملفوظات کی شکل میں موجود ہیں جو آج بھی بندگان حق کی تربیت وتہذیب اور ان کے تصفیۂ قلوب کے لیے بے حد سود مند ہیں۔ حضرت مخدوم کی سخنرانی کی مجلسوں میں ارادت مندان شیخ ان سے شریعت وطریقت، حقیقت و معرفت اور مسائل دنیوی سے متعلق سوال کرتے تھے جن کے مستند ومعتبر جوابات سے حضرت مخدوم جہان ان کو مطمئن کر دیتے تھے۔ لیکن حضرت کے مریدوں کی تعداد بہت کثیر تھی۔ سارے مریدان کی موعظت وہدایت کی مجلسوں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا کچھ حضرات کے ارشاد کے لیے وہ مکتوبات بھیجتے تھے۔

حضرت مخدوم اپنے مکتوبات کے ذریعہ سلطان وقت کو نصیحت وتلقین کرتے تھے۔ مثلاً فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں خواجہ عابد ظفر آبادی نے حکومت کے ظلم وتعدی

سے اپنے مال واسباب کے تلف ہو جانے کی شکایت حضرت مخدوم سے کی تھی ۔ انھوں نے اپنے ایک مکتوب کے ذریعہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی توجہ اس ظلم وتعدی کی طرف مبذول کرائی اور نہایت موجہ وشایستہ انداز میں سلطان کو عدل وانصاف کا احساس دلایا۔ اسی طرح سلطان محمد تغلق کے داماد داؤد ملک کے نام ایک نہایت پند آموز مکتوب لکھا۔ اس مکتوب میں حضرت مخدوم جہان کی فروتنی اور کسر نفسی کا اظہار ہوتا ہے ۔ امراء میں سب سے زیادہ مکاتیب قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کے نام لکھے گئے ۔ ان مکاتیب میں حضرت مخدوم الملک نے عرفان وتصوف ،شریعت وطریقت ،اخلاق وآداب کے نکات کو بڑی صراحت ووضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے۔

حضرت مخدوم نے قاضی شمس الدین کو اپنے مکتوبات میں جو نصیحتیں کی ہیں ان میں سے چند مثالاً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

ایک مکتوب میں مخدوم جہاں لکھتے ہیں ''یہ ضروری ہے کہ کپڑا ،جسم اور لقمہ پاک وحلال ہو،حواس خمسہ بھی معصیت سے پاک ہو اور دل بھی اوصاف ذمیمہ یعنی بخل و حسد وغیرہ سے پاک ہو۔ اول کی پاکیزگی سے مرید راہِ دین میں دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے ۔ اور تیسرے کے تصفیہ سے مرید تین قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور مرید پر توبہ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

ایک مکتوب میں حضرت مخدوم تحریر فرماتے ہیں:

برادرم شمس الدین ! معلوم ہو کہ خداوند تعالیٰ کے دو خزانے ہیں ،سعادت و شقاوت ۔ ایک کی کنجی اطاعت ہے اور دوسرے کی کنجی معصیت ہے ۔ یعنی سعید وہ ہیں جو ماں کے پیٹ ہی میں سعید ہوئے ۔ ان کے ہاتھ میں سعادت کی کنجی یعنی طاعت دی گئی اور ازل سے شقی وہ ہیں جو ماں کے پیٹ ہی سے شقی ہوئے ۔ ان کے ہاتھ میں شقاوت کی کنجی یعنی معصیت دی گئی اور آج ہر شخص اپنے ہاتھوں میں دیکھ سکتا ہے کہ کون سی کنجی اس کے پاس ہے اور یہ بات سنت الٰہی کے مطابق ہے ۔ سعید وشقی کو علمائے آخرت

دیکھتے ہیں نہ کہ علمائے دنیا۔ لیکن بندہ کی تمام عزت و دولت اسی میں ہے کہ وہ طاعت و عبادت میں مشغول رہے۔

معاملات کی بابت ارشاد فرماتے ہیں:

''ہر وہ معاملہ جس کا جواز قرآن میں نہیں ہے بیجا ہے۔ ہر خواہش جو شریعت میں نہیں ہے باطل ہے۔ ہر دلیل جو دین کی تائید میں لائی جائے لیکن دینی نہیں ہے محض باطل ہے اور ہر استعانت جو دین کی خاطر کی جائے لیکن دینی نہیں ہے مردود ہے۔''

ایک مکتوب میں تحریر کرتے ہیں کہ امرا، ملوک، اصحاب منصب، ارباب قدر و منزلت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچنے کا سب سے نزدیک راستہ یہ ہے کہ وہ عاجزوں کی دستگیری اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کریں۔ چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں تو بہت ہیں لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے۔ ان بزرگ سے کہا گیا کہ جس شہر کے وہ رہنے والے ہیں اس کا بادشاہ شب بیدار ہے۔ نفل نمازیں بہت پڑھتا ہے نفل روزے بھی رکھتا ہے، فرمایا بیچارے نے اپنے کو تو کھو دیا ہے لیکن دوسرے کے کام میں لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے اس بزرگ سے پوچھا کہ آخر اس بادشاہ کا اپنا کام کیا ہے۔ تو فرمایا کہ اس کا اپنا کام تو یہ ہے کہ طرح طرح کے کھانے پکوائے اور بھوکوں کو پیٹ بھر کھلوائے، طرح طرح کے کپڑے سلوائے اور ننگوں کو پہنوائے، اجڑے دلوں کو آباد کرے، حاجت مندوں کی دستگیری کرے۔ نفل نماز اور نفل روزے تو درویشوں کے کام ہیں۔

اور دوسرے امراء جنھوں نے مخدوم جہاں کے ارشاد و ہدایت سے استفادہ کیا ان میں قاضی صدر الدین، ملک معز الدین، شمس الملک شمس الدین خوارزمی وغیرہ تھے۔ ان امراء کو جو مکتوبات لکھے گئے ان میں سے کسی میں حضرت مخدوم کی عالمانہ حیثیت کا ثبوت ملتا ہے اور کسی میں ان کی طبیعت کی فروتنی اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مکاتیب میں بزرگانہ دلجوئی وشفقت کے اشارات ملتے ہیں۔

حضرت مخدوم جہاں اولیا واصفیا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ منصور حلاج بھی جو مسئلہ توحید سے متعلق اپنا مخصوص نظریہ رکھتے تھے، جس کا وہ برملا اظہار بھی کرتے تھے، ان کی نظر میں ناپسندیدہ نہیں تھے۔ ایک مجلس میں منصور حلاج کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے زمانہ میں بہت سارے اقطاب واولیا موجود تھے لیکن کسی نے ان کو ان کے گستاخ و بیباک خیال سے باز نہیں رکھا۔ اگر وہ ہوتے تو انھیں قتل ہونے نہیں دیتے اور انھیں مقام فردیت سے زوجیت میں لے آتے۔

ایک مجلس میں قاضی زاہد نے ان سے سوال کیا کہ مردان حق کی صفتیں جو آپ بتاتے ہیں، ان کے مطابق ہندوستان میں کوئی مرد حق ہے یا نہیں۔ حضرت نے جواب دیا کہ ایسا شخص پانی پت کا دیوانہ ہے۔ ان کا اشارہ حضرت بوعلی قلندر پانی پت کی طرف تھا۔ شیخ عز کاکوی اور احمد بہاری دونوں وحدت الوجودی صوفی تھے۔ اپنے غیر معتدل اور متجاوز خیالات کے باوجود وہ حضرت مخدوم کی نظر میں محترم تھے۔ دہلی میں جب یہ دونوں حدِ آداب شریعت سے بیروں خیالات کے اظہار کے جرم میں گردن زدنی قرار دیے گئے تو حضرت مخدوم جہاں بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔ ان کے قتل پر اپنی ناپسندیدگی و ناخوشی کا اظہار بھی کیا تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے تو تعجب ہے اگر وہ آباد ہے۔

حضرت مخدوم الملک سماع کا ذوق رکھتے تھے لیکن وہ اپنے مرشد کی بتائی ہوئی شرطوں کے مطابق سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ محفل سماع میں جب کبھی حضرت مخدوم جہاں کو وجد آتا تو اسے ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے۔ وہ خلوت میں چلے جاتے تھے اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت نے مکتوبات سہ صدی اور بعض ملفوظات میں بھی سماع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار مستند طور پر کیا ہے۔ ان کے ملاحظات کا خلاصہ یہ ہے کہ سماع اگر محبت ایزدباری کا موجب ہو اور مکاشفہ کی صورت پیدا ہو اور مشاہدۂ حق میں معاون ہو تو یہ حلال ہے۔ اور اگر یہ تمایلات شہوانی کا

محرک ہو تو یہ حرام ہے۔ اگر سماع کے سننے سے دل کچھ حق کی طرف مائل ہو اور کچھ غیر حق کی جانب بھی ملتفت ہو تو یہ مکروہ ہے۔ لیکن حق کی طرف نسبتاً زیادہ متوجہ ہوتا ہو تو یہ مباح ہے۔ حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ سماع اہل حق کے لیے مستحب ہے۔ اہل زہد کے لیے مباح ہے اور اہل نفس کے لیے مکروہ ہے۔ اور طلب منفعت کے لیے اگر ایسی محفل آراستہ کی جائے تو یہ مذموم ہے۔ حضرت مخدوم محفل سماع کے انعقاد کے لیے تین شرطیں بتاتے ہیں۔ مکان، اخوان اور زمان ومکان یعنی جہاں محفل سماع منعقد ہوتی ہو وہ جگہ نظیف و پاکیزہ ہو اور اس محفل میں جو شریک ہوں وہ صوفیانِ باصفا ہوں، ریاضت کش فقرا ہوں اور ہنگام سماع دل تمام دنیاوی خیالات سے پرداختہ ہو۔ مجلس سماع میں شرکاء کو دوزانو ہو کر بیٹھنا چاہئے۔ سرنگوں رہیں۔ چپ وراست نہیں دیکھیں اور وقت سماع گفتگو نہیں ہونی چاہئے اور دل حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔

حضرت مخدوم جہاں شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی وفات ۷۸۲ھ میں ۶؍شوال پنجشنبہ کی شب میں نماز عشاء کے وقت ہوئی۔ اس روز فجر کی نماز کے بعد اپنے مریدوں سے مصافحہ ومعانقہ کرتے، ان کو دعائیں دیتے اور متصلاً آیات قرآنی اور کلمے پڑھتے تھے۔ مغرب کے وقت حضرت نے نماز ادا کی، کلمہ طیبہ اور مناجات پڑھتے رہے اور تمام اہل ایمان کے لیے دعائیں کرتے ہوئے اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ نماز جنازہ پڑھانے والا صحیح النسب سید ہوگا، تارک مملکت ہوگا اور حافظ قرأت سبعہ ہوگا۔ عین نماز جنازہ کے وقت حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کا ورود ہوا۔ مندرجہ بالا تینوں شرطیں حضرت اشرف جہانگیر میں موجود تھیں۔ لہٰذا جنازے کی نماز انھوں نے پڑھائی۔ حضرت مخدوم جہاں کے سفرِ آخرت کے وقت ان کے نہایت مخلص مخصوص اور مقرب ارادت مندان جوان کے پاس تھے ان میں قاضی شمس الدین، قاضی زاہد، مولانا تقی الدین اودھی، مولانا آمون، مولانا شہاب الدین ناگوری، مولانا نظام الدین اودھی، شیخ خلیل الدین اور بیچارہ مسکین زین بدر عربی تھے۔

حضرت مخدوم الملک نے شعر گوئی میں طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ ان کے شاعر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے لیکن وہ سخن شناس یقیناً تھے۔ شعر فہمی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اپنے نثری کارناموں کی مختلف صنفوں میں انھوں نے محل وموقع کی مناسبت سے معروف شاعروں کے معنی خیز اشعار کو جس طرح بروے کار لایا وہ ان کی سخن سنجی کا نشاندہ ہے۔ لیکن نثر نویسی میں ان کے کارنامے مقدار و معیار دونوں اعتبار سے غیر معمولی ہیں۔ انھوں نے تصوف وعرفان، دین وایمان سے وابستہ نکات کو نہایت بلیغ و سلیس نثر میں بیان کیا ہے۔ شریعت وطریقت کے دقیق مسائل بھی ان کے دلکش اسلوب سے روشن ہو جاتے ہیں۔

ان کے مکتوبات کی فہرست میں مکتوبات صدی، مکتوب دوصدی، مکتوبات بست وہشت، اور فوائد رکنی ہیں۔ ان کے ملفوظات کے دائرے میں معدن المعانی، خوان پُر نعمت، مخ المعانی، تحفۂ غیبی، گنج لایفنیٰ، مونس المریدین، راحت القلوب، ملفوظ الصفر، بحرالمعانی، مغزالمعانی ہیں اور ان کے رسائل وکتب کے شمار میں درج ذیل تالیفات آتی ہیں:

ارشاد الطالبین، ارشاد السالکین، رسالہ مکیہ وذکر فردوسیہ، شرح آداب المریدین، فوائد المریدین، اجوبہ، لطائف المعانی، عقاید اشرفی، اوراد کلاں، اوراد اوسط، اوراد خرد، اشارات، رسالہ در بدایت حال، مراۃ المحققین، رسالہ وصول اللہ۔

۱۔ **مکتوبات صدی:** یہ مکتوبات قاضی شمس الدین حاکم چوسہ کے نام تحریر ہوئے تھے۔ موصوف حضرت مخدوم کے معروف مریدوں میں سے تھے۔ سرکاری کاموں کی مشغولیت کے سبب وہ حضرت مخدوم کی تعلیمی مجلسوں میں شریک ہونے سے قاصر تھے اس لیے حضرت ان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ان کے نام مکاتیب ارسال فرماتے تھے۔ حضرت انکا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ ان کے سعادت مند مریدوں میں سے تھے۔ حضرت مخدوم ان کو اپنا فرزند تصور کرتے تھے۔ سفر آخرت کے وقت بڑی محبت سے ان کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ ان کی وجہ سے ہی مجھے لکھنا پڑا اور میرے ظاہری و باطنی علوم کا

اظہار واشتہار انھیں کے سبب ہوا۔ ان مکتوبات کے جامع وکاتب مولانا زین بدر عربی تھے۔ اس مجموعۂ مکتوبات کا سال تصنیف ۷۴۷ھ ہے۔ مکتوبات صدی کئی بار مختلف مطابع سے چھپ چکے ہیں۔

۲- **مکتوبات دوصدی:** اس مجموعہ میں ۱۵۱ مکتوبات ہیں۔ اس کے بھی جامع مولانا زین بدر عربی ہیں۔ مولانا نے ان مکتوبات کو مکتوبات صدی کی جمع آوری کے بائیس سال بعد ۷۶۹ھ میں ترتیب دیا تھا۔ لیکن خدابخش لائبریری میں جو اس مجموعہ کا نسخۂ خطی ہے اس میں مرتب کا نام محمد بن محمد بن عیسی البلخی المدعو بہ اشرف بن رکن ہے۔ یہ مکتوبات بھی طبع ہو چکے ہیں۔ یہ مکتوبات حضرت مخدوم نے اپنے مختلف مریدوں کے نام لکھے تھے۔

۳- حضرت مخدوم کے مکتوبات کا ایک مجموعہ انڈیا آفس میں ہے۔ جس میں ایک سو پچیس مکتوبات ہیں۔ اس میں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام بھیجے گئے مکاتیب ہیں جن کو حضرت مخدوم فرزند کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

۴- **مکتوبات بست وہشت:** یہ مکتوبات جن کی تعداد اٹھائیس ہے۔ مولانا مظفر بلخی کے نام لکھے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ حضرت مخدوم الملک نے مولانا مظفر بلخی کے نام لکھے دوسو سے زیادہ خطوط لکھے تھے جن کو مولانا مظفر بلخی مخفی ومحجوب رکھنا چاہتے تھے۔ اگرچہ بیشتر خطوں کو ان کی وصیت کے مطابق ان کے مریدوں نے مدفون کر دیا، لیکن یہ اٹھائیس مکاتیب دفن نہیں کیے جا سکے۔

۵- **فوائد رکنی:** ایک مختصر رسالہ ہے جس میں گیارہ فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ اسے رکن الدین کی درخواست پر جو زیارت حرمین شریف کے لیے عازم سفر تھے کے لیے لکھا تھا۔ اسے ۷۶۹ھ کے بعد مخدوم نے تحریر فرمایا تھا۔ یہ حضرت کے مکتوبات کا اختصار ہے۔ یہ مکتوبات کی طرز میں بیان ہوا ہے۔ حضرت بدر عربی نے اس مجموعہ کے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کا ذکر کیا ہے۔ فائدہ اول میں عشق الٰہی پر زور دیا گیا ہے، کیونکہ بندہ کو خدا سے واصل کرانے کا وسیلہ عشق ہی ہے۔

فائدہ دوم میں راہ کی دشواری، منزل کی دوری اور ان کی بیچارگی کا ذکر ہے۔
سوم فائدہ میں عظمت انسانی کا بیان ہے۔ انسان خلاصۂ موجودات ہے۔
فائدہ چہارم میں یہ تعلیم ہے کہ ارادت کے ابتدائی مرحلے میں مریدوں کو چلّے کی ہدایت کیوں دی جاتی ہے۔ فائدہ پنجم میں یہ ارشاد ہے کہ مریدوں کو خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا ہونا چاہئے اور پیر و مرشد کو رسول کریم کے مانند ہونا چاہئے۔ فائدہ ششم میں دنیا کو غدار اور فریب کار بتایا گیا ہے اور اس سے بے تعلق رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح بقیہ فائدوں میں تواضع وانکساری کی تعلیم ہے۔ صوفیہ کرام کے رموز واشارات کا بیان ہے اور دنیا کو نہایت کثیف جگہ بتائی گئی ہے اور اس سے اجتناب کرنے کی نصیحت کی گئی ہے۔

مخدوم الملک کی جملہ تصنیفوں میں سب سے زیادہ درخور اہمیت ان کے مکتوبات ہیں۔ معروف اولیا و مشائخ نے حضرت کی اس مراسلاتی تصنیف کی اس کے لاآلیِ فکر و معنی کی بنا پر ستایش کی ہے اور اسے تحت ملاحظہ رکھ کر اس سے استفادہ کیا ہے۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت سید جلال الدین بخاری جیسے خدا شناس بزرگوں نے اس تصنیف کو اپنے مطالعہ کا مورد بنایا۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں:

''وفراوان تصنیف از و یادگار، از آنمیان مکتوبات او درسر شکنی نفس آزمون دارد۔'' مولانا عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخیار'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اور را تصانیف عالی است، از جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور ولطیف ترین تصانیف است۔ بسیاری از آداب طریقت واسرار حقیقت درآنجا اندراج یافتہ''۔

فوائد رکنی میں حضرت مخدوم عشق وجنوں کی حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ جس طرح ظاہری تہذیب وانضباط کے لیے صوم وصلوٰۃ کو لازمی قرار دیا گیا ہے، باطن میں عشق ومحبت کی کیفیت کا ہونا ضروری سمجھا گیا۔ عشق کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ یہ مایۂ

روحانی انسان کو خدا سے قریب کر دیتا ہے۔ عشق بن جینے سے مرجانا بہتر ہے۔ خلق جہان وجہانیان کا مقصد عشق کو ظہور میں لانا تھا۔ لہٰذا نظام کائنات کی اساس عشق ہے۔

فارسی شاعروں کا اساسی موضوع عشق رہا ہے۔ ان شاعروں نے مختلف شیوہ و اسلوب میں علی الخصوص غزل اور مثنوی کے قالب میں عشق کے اسرار ومشخصات کو بیان کیا ہے۔ یہاں فوائد رکنی میں حضرت مخدوم نے فلسفۂ عشق کی نہایت دلکش و ذہن افروز توضیحات بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طالب حق کو مجنوں کی طرح شیدا ہونا چاہئے جس نے پتھروں کی چوٹیں کھائیں لیکن اس نے اپنے صدمہ و درد کا اظہار نہیں کیا۔ اس میں فرہاد کی طرح مراد ومقصود کے حصول کے لیے کوہ بیستون کو کھودنے کی ہمت ہونی چاہئے۔
مکتوبات کے اس خلاصہ میں حضرت مخدوم نے تجرید وتفرید جو تصوف کے باریک ولطیف نکات ہیں کو نہایت مبرہن ومعتبر انداز میں بیان کیا ہے۔ تجرید کا مفہوم حضرت مخدوم کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ انسان کو علائق دنیوی سے یکسر کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ اور تفرید اس سے آگے کی منزل ہے جہاں انسان کو اپنی ہستی فراموش کر دینا ہوتا ہے۔ تجرید وتفرید سے گزر جانے والا انسان فرشتہ صفت ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی کدورت نہیں ہوتی اور جملہ دنیاوی خواہشات ومیلانات سے وہ مبرّا ہوتا ہے۔

تجرید وتفرید سے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ تجرید وتفرید کی سعادت انسان کو ادعا سے جدا کر دیتی ہے۔ موت وحیات صاحب تفرید وتجرید کے نزدیک یکساں ہیں۔ اور لوگوں کے مدح وذم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ماسویٰ اللہ کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔ ننگ ونام، سکون وآرام کی اسے پروا نہیں ہوتی۔ دنیا وآخرت کی شوکت وسعادت اس کی ہمت کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

پھر فرماتے ہیں کہ کارخانۂ ایزدی کو سمجھنا انسان کے لیے محال ہے۔ نظام عالم خدا کی مشیت کے اشارے پر چلتا ہے۔ آذر بت تراش کے گھر میں ابراہیمؑ کا عالم وجود میں آنا اور رسول صلعم کا عبداللہ کے گھر میں پیدا ہونا جب کعبہ بت کدہ بنا ہوا تھا، عقل کی

بیچارگی کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ بشر اشرف المخلوقات ہے۔ موجودات کا زبدہ وخلاصہ ہے۔ اس کائنات میں جملہ اشیا و اسباب اسی کے لیے ہیں۔ خدا کی قدرت کاملہ نے مشت خاک سے آدم کو بنایا، پھر ملائکہ کو حکم ہوا کہ وہ آدم کی آستانِ عظمت و جلال کی تعظیم کریں کہ اس کا مرتبہ ساتوں آسمان سے بلندتر ہے۔ اور پھر اس تخلیق بے نظیر کو سجدہ کرنے کا حکم فرمایا کہ وہ دنیا میں اس کا خلیفہ ہے۔ فوائد رکنی کے ایک جزو میں تصوف کے رموز کی وضاحت کی گئی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں (۱) لباس وجسم کا پاک ہونا اور طعام کا حلال ہونا (۲) حواس خمسہ یعنی باصرہ، سامعہ، شامّہ، ناطقہ اور لامسہ کو گناہوں سے محترز رکھنا (۳) دل کو اوصاف ذمیمہ مثلاً بخل، کینہ، حسد، ریا وغیرہ سے محفوظ رکھنا۔ جب طہارت کے پہلے مرحلے کی سعادت حاصل ہوجائے تو گویا مرید دین کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھا۔ اور جب دوسرے مرحلے کی باتوں کو حاصل کرلے تو مرید راہ دین پر دو قدم آگے ہو چکا ہے۔ اور جب تیسرے مرحلے کی شرطوں کو پورا کرلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ مرید دین کی راہِ مستقیم پر تین قدم آگے بڑھ چکا ہے۔ یہ مقام توبہ کا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد مرد صدق دل سے تائب ہوجاتا ہے۔ اصطلاح تصوف میں اس مقام کو گردش کہتے ہیں۔ یعنی کدورت و کثافت سے نکل کر مرید طہارت و پاکیزگی کی منزل پر پہنچتا ہے۔ یعنی پہلے کلیسا تھا اب مسجد جیسا ہوگیا۔

ایزد متعال کی شانِ بے نیازی کے بارے میں حضرت مخدوم ملاحظہ فرماتے ہیں کہ بشر کی طاعت و بندگی، عبادت و ریاضت سے اس کے مرتبۂ الوہیت میں فزونی پیدا نہیں ہوتی اور نہ کسی کے کفر وعصیان سے اس کے مقام کبریائی میں زوال پیدا ہوتا ہے۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

زعشقِ ناتمامِ ما جمال یار مستغنی ست　　　　بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روی زیبارا

اگر سارا عالم حرم کعبہ میں تبدیل ہوجائے یا ساری دنیا کنشت و بتخانہ بن جائے اور تمام بنی آدم واجتہ نمرود وفرعون کے مانند نافرمان و بے ایمان ہوجائیں تو بھی اس کے عظمت و

جلال میں کم وبیش نہیں ہوگا۔ خداوند متعال کو نہ موسیٰ سے منفعت ہے اور نہ فرعون سے خسارت۔

مکتوبات سہ صدی کے پہلے مکتوب میں حضرت مخدوم نے مسئلہ توحید کو ہدفِ بحث ونظر قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ'توحید، کے چار درجے ہیں (۱) زبان سے تشہد کا اظہار کرنا مگر دل سے اس کی تائید نہ کرنا یہ منافقت ہے (۲) بہ صدق دل کلمۂ شہادت کو زبان سے ادا کرنا اوراس پر اعتقاد رکھنا جیسا کہ عام مسلمانوں کا شیوہ ہے، ان میں بہت سارے صاحبِ علم ودانش مسلمان بھی ہیں جو خدا کی وحدانیت کی حمایت میں محکم دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں (۳) ریاضت وروحانی مشقت سے ایسی روشنی وبصیرت حاصل کرنی کہ اسے یقین کامل ہو جائے کہ فاعل حقیقی وہی ذات احد ہے۔ یہ عارفانہ توحید کا درجہ ہے، اور یہ تصوف کی اصطلاح میں ''ہمہ از اوست'' کی منزل ہے (۴) وفور ریاضت کشی میں سالک جادۂ حقیقت اس درجہ ڈوب جاتا ہے کہ یہ عالم جو فی الحقیقت ذات حق کے جلال و جمال کا انعکاس ہے اس کو نظر نہیں آتا۔ اس مقام میں خدائے لم یزل کے سوااس کی آنکھیں کچھ بھی نہیں دیکھتیں۔ اس پر فنائیت مستولی ہو جاتی ہے۔ یہ فنا فی التوحید کا مرحلہ ہے۔ جس کو ہمہ اوست کہتے ہیں۔ فنا فی التوحید کے بعد ایک منزل ہے جسے الفناعن الفنا کہتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد سالک کو کمال استغراق میں اپنے فنا ہونے کا بھی ہوش نہیں رہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سالک خود کو اا ور تمام کائنات کو انوار ایزدی کے دریائے بیکراں میں غرق کر دیتا ہے۔ اسے اپنے گم ہونے کی بھی خبر نہیں رہتی۔

تو دروگم شو کہ توحید این بود　　　گم شدن گم کن کہ تفرید این بود

حضرت مخدوم نے یہاں پر یہ بھی واضح کیا ہے عالم فنا اور مکمل استغراق کے عالم میں وہ شش جہات میں انوار الٰہی کا مشاہدہ کرتا ہے اور ہر وہ شے جس کی صورت سے وہ واقف تھا اس کی حقیقت اور معنویت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

حضرت مخدوم نے ان مکتوبات میں ان وسائل و موجبات کا بھی ذکر کیا ہے جن سے تجلیٔ دیدارالٰہی حاصل ہوتی ہے۔ جو بقرار ذیل ہیں:

توبہ، صدق ایمان، معرفت، تقویٰ، مجاہدہ اور ریاضت نفس اور ترک دنیا۔

حضرت نے توبہ کے تین مراتب بتائے ہیں (۱) عام لوگوں کی توبہ کہ وہ اپنے تمرّ دوسرکشی کے لیے معافی کا طالب ہوتا ہے (۲) خواص کی توبہ کا سبب یہ ہے کہ ان کے خیال میں خدا کا لطف و کرم، اس کی نعمت ونوازش اس درجہ زیادہ ہے کہ انسان اس کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی منّتوں کا انسان صحیح طور پر سپاس گزار بھی نہیں ہوسکتا۔ (۳) اور خاص الخاص لوگوں کی توبہ کا موجب یہ ہے کہ یہ خدا رسیدہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے خود کو بیچارہ و ناتواں نیست و ناچیز کیوں نہیں خیال کیا جب کہ موجود و مہیمن ذات تو صرف خدا کی ہے۔

صدق ایمان کی بنیاد خدا کی عظمت کے یقین پر ہے، اور خدا کی بزرگی کا احساس انسان کے دل میں شرم وندامت کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی مختلف شؤن کا مشاہدہ کرنے کی اسے توفیق حاصل ہوتی ہے۔

تقویٰ یہ ہے کہ انسان ان تمام اشیاء سے مجتنب ہوجائے جن سے اس کے ایمان میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ یہ خلل دو صورت میں پیدا ہوسکتا ہے۔ حرام چیزوں کی طرف مائل ہونے سے اور حلال چیزوں کی جانب حد اعتدال سے زیادہ راغب ہونے سے۔ رغبت و میل کی زیادتی کی کاہش و تعدیل کے لیے مجاہدۂ نفس و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور ترک دنیا مجاہدۂ نفس کے بعد ہی ممکن ہے۔ ریاضت کشی اور نفس کو اپنے اختیار میں کر لینے کے بعد تمایلات دنیوی سے سالک کو نفرت ہوجاتی ہے۔ اور اس کے پاس جو ملک و متاع ہوتی ہے اس سے وہ جدا ہونا چاہتا ہے۔ اس کا طمع وہ نہیں کرتا ہے۔

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد منیری کے ملفوظات ارشادات عرفانی،

اشارات تاریخی اور اطلاعات اجتماعی کا سرچشمہ ہے۔ ان ملفوظات کے وسیلے سے حضرت مخدوم رموز واسرار معرفت روحانی، فرائض شرعی اور امور فقہی کی وضاحت کرتے ہیں۔ علاوہ براین مسائل زندگی کو بھی مورد بحث قرار دیتے ہیں اور زندگی کی مشکلات کے حل کے طور وطریق بتاتے ہیں۔ اگرچہ مکتوبات صوفیہ جو دور دست علاقوں میں مقیم ارادت مندوں کے شرعی وعلمی سوالات کے جوابات پر مبنی ہوتے تھے، اس بنا پر زیادہ معتبر ہیں کہ یہ تحریریں بلاشبہ ان کے قلم کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود ملفوظات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ملفوظات بھی صوفیہ کے عرفان وآگہی کے منابع ہیں اور یہ صاحبِ ملفوظ صوفی سے متعلق عہد کے احوال واقعی کی اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔

مشائخ کے ملفوظات کے موضوعات گوناگوں ہوتے تھے۔ جو ان بزرگوں کے ذہنی وقلبی میلانات کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ صوفیوں کے یہ ملفوظات عقاید واصول دین، الٰہیات، احکام دین، عبادت وریاضت اور وظائف اخلاقی سے متعلق معلومات کے ذرائع ہیں۔ لیکن ادبیات ملفوظ کے ان مجموعوں کی طرز وروش میں یکسانیت نظر نہیں آتی۔ ان کی تنظیم وترتیب، مقدار ومعیار میں لائق توجہ تفاوت ہے۔

ان میں سے بعض ملفوظ مجموعے ماہ وسال اور یوم کے ذکر کے ساتھ ترتیب دیئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے ملفوظات بھی ہیں جو تاریخی ربط وتسلسل سے عاری ہیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے یہ تمام ملفوظات تعلیمات عرفانی پر مشتمل ہیں۔ صوفیوں نے اپنے باطنی تجربات اور کلام الٰہی کی تفاسیر، رسول صلعم کی احادیث، عقاید دین، حدوث وقدم، جبر و اختیار، حرام وحلال سے متعلق مسائل کو ان ملفوظوں میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیہ اپنی ملفوظ موعظتوں کے ذریعہ مریدوں کی زندگی کے معاملات میں بھی رہنمائی کرتے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مذکور ہوا، حضرت مخدوم جہان کے ملفوظات کے کئی مجموعے ہیں۔ جن میں معنوی اور صوری مختصات کے اعتبار سے ''معدن المعانی'' زیادہ

اہمیت کا حامل ہے۔ اس ملفوظ مجموعے کی معنوی جہتیں مختلف ہیں۔ اس میں تصوف و عرفان اور عقیدہ و ایمان سے متعلق کثیر موضوعات ہیں جو۶۳ ابواب پر محتوی ہے اور ۷۴۹ھ سے لے کر ۷۵۱ھ تک کے ملفوظات شامل ہیں۔ اس مجموعے کے جامع اور کاتب حضرت زین بدر عربی ہیں۔ اس کا مطبوعہ نسخہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے جس کی طباعت ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں مطبع شرف الاخبار بہار شریف کے توسط سے ہوئی تھی۔ 'معدن المعانی' حضرت مخدوم الملک کے تمام ملفوظات کے مجموعوں میں مخصوص عنوانات کے تحت مضامین کی تبویب و ترتیب کی بنا پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ملفوظ کے نقائص و تسامحات کی اصلاح حضرت شیخ نے خود کی تھی۔ مرتب زین بدر اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بقدر وسع و احتمال خود آنچہ یاد توانست داشت بتوفیق ازلی آنرا جمع کرد و براین بنا کہ نباید غلطی ولغزی جای رفتہ باشد از جمع کردن این مجموع بجانب وقیع شیخ بزرگوار خود عرضداشت و التماس نمود کہ مجلس شریف ہرچہ بندۂ خاکپای در کتابت آورد بگذرد، از کمال عاطفت ملتمس بیچارہ را بہ اجابت مقرون گردانید تا من اوّلہ تا آخرہ احتیاط در مجلس وقیع بگذشت و چند جا کہ بیچارہ را در کتابت سہوی رفتہ بود بلطف اصلاح فرمودہ۔''

اس مجموعۂ مستطاب کے کچھ عنوانات بشرح ذیل ہیں:

در ذکر اثبات وجود حق تعالیٰ، روحانیت او جل جلالہٗ، در ذکر علم شریعت، طریقت و آنچہ مناسب آنست، در ذکر اولیای حق، در ذکر مجاہدہ و ریاضت، در ذکر مراقبہ و تفکر، در ذکر حقیقت انسانیت، روح، دل، نفس و عظمت بشر، در ذکر قضا و قدر، در ذکر تعبیر خواب، در ذکر سماع۔

اثبات وجود حق تعالیٰ کے تحت عنوان حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ کائنات کا ہر

ذرہ چار چیزوں کی گواہی دیتا ہے جو درج ذیل ہیں :اوّل یہ کہ وہ اقرار کرتا ہے کہ عالم نیستی سے فضائے ہستی میں وہ لایا گیا اور وہ خود معرض وجود میں نہیں آیا۔اور یقیناً ایک خالق ہے جس نے اسے نیستی کی تیرگی سے ہستی کے اجالے میں لایا۔اور پھر اپنے وجود کی بنا پر اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ اس کا خالق واحد و لاشریک ہے۔ بے ہمتا اور بے انباز ہے۔اور یہ کہ وہ جمیع اشیائے کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔اور آخراً یہ کہ وہ قادر و توانا ہے، کیونکہ خداوند عالم اگر قدرت و توانائی نہیں رکھتا تو اس سے آفرینش عالم کا کام ممکن نہیں ہوتا۔لہٰذا ہر ذرّہ کائنات اپنے وجود کے متعلق اس بات کو پایۂ تحقیق تک پہنچاتا ہے کہ ایزد متعال وجود رکھتا ہے، واحد ہے اور علیم و قادر ہے۔

علم شریعت و طریقت کے تحت حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ سالکانِ جادۂ عرفان و جویندگان راز ہای حقیقت ہستی کے لیے طریقت کا علم لازم ہے۔علم طریقت سالک خود اپنے ہمت و حوصلہ سے حاصل کرسکتا ہے اور کسی شیخ طریقت کے ارشاد و ہدایت کے ذریعہ بھی اس علم کو سیکھا جاسکتا ہے ۔ اور شریعت بندے کی عبادات اور معاملات حیات سے متعلق ہے جس کا علم لازم ہے۔لیکن معاملات جہانی کا علم عرفان کے مراحل کو طے کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے۔

اور ذکر اولیای حق کے تحت حضرت مخدوم کلمہٗ ''اولیائی تحت قبائی'' جو رسول صلعم کی حدیث ہے کی وضاحت فرماتے ہیں کہ رسول کریم نے فرمایا تھا کہ میرے اولیا میرے دامن کے نیچے ہیں ۔جیسا کہ مخدوم نے بیان کیا،اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اکرمؐ اولیا کا بڑا احترام کرتے تھے۔اور اس سے متعلق حضرت نے خواجہ جنید بغدادی سے متعلق ایک حکایت بیان کی ہے۔سخنرانی کی اس مجلس کے اثنا میں قاضی اشرف الدین نے مخدوم سے سوال کیا کہ کیا اولیا اپنی کرامات کی بنا پر جو کبھی کبھی ان کے ذریعہ ظہور میں آتی ہیں گمان کرتے ہیں کہ وہ ولایت کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں ۔ حضرت نے جواب دیا کہ کچھ اہل دانش کا خیال ہے کہ یہ حضرات کرامات کے وسیلے

سے اپنی روحانی حیثیت سے باخبر ہوجاتے ہیں لیکن بیشتر اہل الرائے کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ حضرات اپنی کرامات کی وجہ سے اپنی ولایت پر یقین نہیں رکھتے کیونکہ کبھی کبھی ان میں دائرہ اسلام سے باہر لوگوں کے مکروفسون کا عمل شامل ہوجاتا ہے اور یہ مکر کرامت کے لباس میں پوشیدہ رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اولیا ہر وقت اس مسئلہ میں تشکیک کے حال میں ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو کرامات کے لائق تصور نہیں کرتے ہیں۔ لیکن ''کشف المحجوب'' کے مصنف حضرت عثمان ہجویری کا خیال ہے کہ دانشمندوں کی یہ فکر درست نہیں ہے کہ اولیا اپنے مرتبۂ ولایت سے بے خبر رہتے ہیں اس لیے کہ ولی وحق تعالیٰ کے مابین ایسے رموز واسرار ہر لمحہ گزرتے رہتے ہیں جن کی خبر دوسروں کو نہیں ہوتی اور یہ اولیا کرامت اور مکر کے مابین فرق کو بخو احسن سمجھتے ہیں۔ مجاہدہ وریاضت کے تحت عنوان حضرت اظہار نظر فرماتے ہیں کہ کچھ علماء یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مجاہدہ وصل حق تعالیٰ کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن اکثر اہل نظر کا خیال ہے کہ مجاہدہ قرب الٰہی کا سبب نہیں، کیونکہ مقامات معنوی کے بہت سارے طالبان ریاضت کشی کے باوجود گوہر مقصود کو نہیں پاتے ہیں۔ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب مولانا قاسم نے اس مسئلہ کے ضمن میں اس آیت کریمہ کا ذکر کیا ''والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سُبُلنا'' اور اشارہ کیا کہ اس آیت میں مشیت مضمر ہے۔ حضرت مخدوم نے لطف وکرم کے ساتھ جواب دیا کہ اس کلمۂ حق کہ جس میں مشیت ایزدی مضمر ہے کی بنا پر بعض حضرات مجاہدہ کو وصل ایزدمتعال کے لیے علت قرار دیتے ہیں لیکن اضافہ کیا کہ یہ صاحبانِ دانش ودین مجاہدہ کو اس طرح وصل الٰہی کی علت قرار دیتے ہیں کہ مجاہدہ کی جملہ شرائط کو صدق وخلوص کے ساتھ عمل میں لایا جائے۔ اور کوئی شخص اگر مجاہدہ کرتا ہو پھر بھی اپنے مقصود ومرام سے دور رہتا ہو تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ریاضت کشی کے لزومات کو صدق و صمیمیت کے ساتھ انجام نہیں دیا۔ ذکر ومراقبہ کے تحت عنوان حضرت شیخ اہل مجلس کو خاطر

نشان کرتے ہیں کہ مراقبہ قلب کو برائیوں سے باز رکھتا ہے اور اس عمل سے بشر کے دل میں یہ یقین محکم ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم انسان کے جملہ احوال ظاہر و باطن کا علیم و بصیر ہے۔ اور جب سالک کو اس امر پر اطمینان کامل حاصل ہو جاتا ہے کہ خدا ہر دم اس کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ضمیر کے گوشوں میں پنہاں خواہشوں سے وہ واقف ہے تو وہ حتماً اپنے دل کا مراقب ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجۂ اپنے آپ کو افعال زشت سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور بعض مشائخ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ متصلاً یہ اپنے عقیدت مندوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مراقبہ کو وہ لازم سمجھیں۔ اور اس بنا پر کہ ارادت مند اگر اپنے باطن کا مواظب ہوگا اور اس کا خیال اس حقیقت کی طرف منعطف ہوگا کہ قادر مطلق اس کے احوال واوضاع کا ناظر ہے تو وہ جنایت کے ارتکاب سے محفوظ رہے گا اور منکرات سے حذر کرے گا۔ ذکر و بحث کے اثنا میں قاضی اشرف الدین نے حضرت سے التماس کی کہ مراقبہ و تفکر میں جو تفاوت ہے اس کی وضاحت فرمائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مراقبہ قلب کی نگہداشت ہے جب کہ تفکر کا مفہوم سوچنا اور غور و تامل کرنا ہے۔ حضرت مخدوم نے اس مسئلہ کے متعلق مزید یہ فرمایا کہ کچھ مشائخ نے اس امر کی بابت ارشاد فرمایا ہے کہ سالک کو یہ لازم ہے کہ وہ ازل و ابد کو مورد تفکر قرار دے اور اپنے مقدر کو معلوم کرنے کے لیے فکر و اندیشہ میں مستغرق رہے اور اس حقیقت کی دریافت کے لیے کہ آیا وہ بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوگا یا مردود قرار دیا جائے گا خود کو غور و تعمق میں ڈال دے۔ اگر اس کے اعمال ناپسندیدہ ہوں گے اور حق و صداقت کی کسوٹی پر کھرے نہیں اتریں گے تو لاجرم وہ اپنے شیوہ ہائے عمل میں تبدیلی لانے کی سعی کرے گا اور افعال شنیع سے کنارہ کش ہوگا۔

تحتِ عنوان ''در ذکر حقیقت انسانیت، روح، دل، نفس و عظمت بشر'' حضرت مخدوم حقیقت انسانیت کو مورد بحث قرار دیتے ہیں اور اظہار نظر فرماتے ہیں کہ حقیقت انسانیت کو کسی نے کما حقہ، دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اور جس نے بھی اس موضوع کو ہدفِ بحث و نظر قرار دیا ہے اس نے صرف انسانیت کے اوصاف بتائے ہیں،

انسانیت کو مستقیماً مورد مطالعہ نہیں بنایا۔ انسان بالذات کیا چیز ہے۔ ماہیت انسانیت کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ کیا انسان فقط چہار عنصر کے پیوند و اتصال کا نتیجہ ہے یا آب وخاک پر اس کو تفوق حاصل ہے اور ایسی صورت میں خاک سے اس کی نسبت کو کس طرح سمجھنا چاہئے۔ ماحصل یہ کہ حقیقت انسان کی تلاش وتفحص میں متفکرین مبہوت ومتحیر ہیں۔ اگر کوئی یہ سوچے کہ یہ تمام مناظر ومظاہر واقعات وسانحات قادر مطلق کی جانب سے ہیں اور انسان ان مسائل کے حل میں بیچارہ وناتواں ہے تو جبر گرائی کے الزام کا وہ مورد ہوگا اور اگر کوئی اسے ظہور مادّی کا ایک نمونہ قرار دے جو تقیّدات سے وارستہ ہے اور اپنے افعال میں مطلق ہے تو قدر کا الزام اس پر وارد ہوگا۔ حق تعالیٰ کی جانب سے کُنہ انسانیت کسی پر اس وقت منکشف ہوتا ہے اور ہستی کے اسرار اس پر آشکار ہو جاتے ہیں جب اس کی جان بندِ کالبد سے آزاد ہو جاتی ہے۔ تمثیل کے طور پر حضرت مخدوم اس نکتہ کی توضیح فرماتے ہیں کہ جب تک پروانہ شمع کے چاروں طرف رقص کرتا رہتا ہے وہ شمع کی حقیقت سے بے خبر رہتا ہے اور جب وہ اپنی جان کو شمع پر نثار کر دیتا ہے تو وہ زندہ کب رہتا ہے کہ حقیقت شمع کو بیان کرے۔ اس درمیان ایک شخص نے حضرت مخدوم سے روح کے بارے میں سوال کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ اس امر سے متعلق بحث کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اور دینی معاملات کی آراستگی کے لیے سودمند نہیں ہے۔ مزید یہ فرمایا کہ روح کا مسئلہ نہایت دشوار ہے اور اس سے متعلق بحث ونظر حیطۂ فہم وادراک سے باہر ہوتی ہے۔ اور اس کی ماہیت کی شرح وتبیین بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ایسی چیز جو دائرہ فہم وادراک سے باہر ہو اس کو ہدف بحث قرار دینا عبث ہے۔ جس نے بھی اس موضوع سے متعلق کچھ کہا ہے اور اپنے عقیدہ کا اظہار کیا ہے اس نے تحقیق کی راہ کو نہیں اپنایا ہے۔ حالانکہ اپنے نظریہ کے اثبات کے لیے دانشمندوں نے دلیلیں پیش کی ہیں۔ اہل دانش استدلال کرتے ہیں کہ روح جوہر ہے اور بعض اہل خرد کا خیال ہے کہ یہ جسم ہے۔ اگر روح جوہر یا جسم نہیں ہوتی تو یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوتی۔ اور خداوند متعال نے رسول اکرمؐ کو روح کی ماہیت کی بابت یہ بتایا: ''قل الروح من امر ربی'' یعنی کہہ دیجئے

کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے۔ اور اس سے متعلق رسول کریمؐ نے خود کچھ نہیں کہا اور صوفیہ کرام و مشائخ عظام نے جو کچھ بھی روح کے بارے میں کہا ہے وہ روح کی فضیلت و مزیّت کے متعلق ہے۔ ان کے بیانات روح کی حقیقت کو واشگاف نہیں کرتے۔

خوان پر نعمت: حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری کے ملفوظات کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کا ایک نسخۂ خطی ۱۸۹ اوراق پر مشتمل ۱۲۷۹ھ کا کتابت کردہ کتابخانۂ خانقاہ بلخیہ پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اول بار یہ مجموعہ مطبع احمدی پٹنہ کے توسط سے ۱۳۲۱ھ میں طبع ہوا جو ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس مجموعہ میں حضرت مخدوم کے مندرج خطبات ۱۵؍شعبان ۷۴۹ھ سے لے کر آخر شوال ۷۵۱ھ تک کی مدت پر محیط ہے۔ یہ ملفوظ ۷۴ مجلسوں پر محتوی ہے۔ اس ملفوظ کے بھی جامع اور کاتب حضرت زین بدر عربی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

> ''چہ لفظ عین عبارت و چہ معنی آن درطی کتاب آوردہ
> شدتا اہل را از مطالعۂ آن مددی روی نماید و معونتی درکار پیدا آید و
> نا اہل را رغبتی و حرکتی روی نماید و ہر دور ماندہ کہ محتاج کاردین بود در
> رشتۂ حبل متین چنگ درزند و نعمت جمعتین برگیرد۔''

ملفوظات کا یہ مجموعہ بھی ''معدن المعانی'' کی طرح قرآن مجید کے معنی و مفہوم کی تفسیر، حضرت رسول صلعمؐ کے احادیث و اخبار، قصص انبیاء، اقوال ائمہ، صحابہ اور اولیا، فقہی سوالات کے جوابات شافی اور تصوف و عرفان کے مسائل کی توضیحات سے مشحون ہے۔ اس ملفوظ کی کچھ مجلسوں میں خدمت خلق کی معنوی قدر و قیمت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً دسویں مجلس میں مذکور ہوا ہے کہ قاضی اشرف الدین نے حضرت مخدوم سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ جس طرح نماز و روزہ، مجاہدہ و ریاضت سلوک کے مقصد و مراد کو حاصل کرنے کے موجبات ہیں، کیا اسی طور خدمت خلق بھی ہدفِ سلوک کے حصول کا وسیلہ ہے۔ حضرت مخدوم نے مثبت جواب دیا اور کہا کہ خدمت خلق، اور خانوادہ کے

افراد کی مراقبت اور اہل وعیال سے شفقت و ہمدردی سلوک کے مراحل کو طے کرنے کے لیے مفید و معاون ہوتی ہیں۔ اس موضوع کو حضرت مخدوم نے چالیسویں مجلس میں بھی بیان کیا ہے اور خدمت خلق کو باب رحمت تصور کیا ہے۔

بیالیسویں مجلس میں قاضی اشرف الدین نے حضرت سے سوال کیا کہ کیا مرتاضان ہندو (جوگیاں) آسمان میں پرواز کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔ حضرت نے جواب دیا کہ ریاضت کشوں کی اس جماعت سے یہ خرق العادہ کام ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ لوگ متصلاً نہایت سخت مجاہدات کرتے ہیں اور مقامات معنوی کے حصول کے لیے جسمانی مشقتیں اٹھاتے ہیں اور نفس کو اپنے اختیار میں کر لیتے ہیں۔ پیہم و پیوستہ ریاضت کشی سے کوئی بھی روحانی بلندی حاصل کرسکتا ہے۔ مومن ہو یا کافر، کوئی بھی جہد مستقل سے اس روحانی کمال کو حاصل کرسکتا ہے۔ ہندو جوگی پیہم بدنی مشقتوں سے ثقل بشریت کو مکمل طور پر زائل کر دیتے ہیں اور اپنے کو سبک ولطیف بنا لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ فضا میں پرواز کرتے ہیں اور پانی کے اوپر چل بھی سکتے ہیں۔

ایک مجلس میں قاضی اشرف الدین نے حضرت مخدوم کی توجہ اس قضیہ کی طرف مائل کی کہ کچھ اہل دانش حضرات کا یہ خیال ہے کہ ایک لمحہ کا تفکر ایک سال کی عبادتوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ایسی صورت میں یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ تفکر عبادت کی تمام صورتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ بعض مشائخ وصوفیہ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ یہ بزرگان شبانہ روز کے اندر دو تین ہزار رکعتیں نماز کی ادا کرتے تھے۔ اگر وہ اس عرصے میں غور وفکر میں مشتغل رہتے تو بزرگتر فضیلتوں سے بہرہ ور ہوتے۔ حضرت مخدوم نے اظہار نظر فرمایا کہ تفکر نفل نمازوں پر ارجحیت رکھتا ہے۔ لیکن اس بات کو تحت توجہ رکھنا چاہئے کہ عبادت کا ہر نوع اپنی مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ زہاد و پارسایان روحانی کمال کے حصول کے لیے اپنے پسندیدہ شیوۂ عبادت کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس وسیلے سے وہ اپنے مرام و مقصود کو پہنچتے ہیں۔ اور بلاشبہ نماز بھی عبادت کے طریقوں میں سے ایک ہے۔

اس گفتگو کے ضمن میں حضرت مخدوم نے حاضرین مجلس کو آگاہ کیا کہ بعض حضرات نماز کو عمداً ترک کرتے ہیں اور اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ نماز اور دوسری عبادتیں مقصود معنوی کے حصول کے ذرائع ہیں۔تو جب مقصود حاصل ہو جائے تو یہ موجبات غیر ضروری ہو جاتے ہیں اور ان کو ترک کر دینا بہتر ہے۔حضرت مخدوم اس مسئلہ کی بابت یہ تعلیم دیتے ہیں کہ نماز مقصود معنوی کو حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ادائے نماز کے مقاصد ہیں۔حضرت مخدوم نے مزید فرمایا کہ جو لوگ مقصود معنوی کے حصول کے بعد نماز کو ترک کر دینے کی بات کرتے ہیں وہ یاوہ گوئی کرتے ہیں اور خداوند متعال سے اس خطا کے لیے ان کو مغفرت طلب کرنی چاہئے۔جمیع مشائخ وعلماء اس عقیدہ پر متفق ہیں کہ انبیا کرام جوایزد متعال سے بے حد قریب تھے اور اپنی منزل کو پہنچ چکے تھے، ادائے نماز کو ہر حال میں لازم سمجھتے تھے۔

عرس کے جواز کے بارے میں حضرت مخدوم الملک نے مخ المعانی کی انتیسویں مجلس اور خوانِ پُرنعمت کی چالیسویں مجلس میں وضاحت کے ساتھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول صلعم یکم ربیع الاول کو اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔صحابہ کے درمیان اختلاف کے سبب تکفین وتدفین کا کام ۳؍ربیع الاول کو انجام پایا۔رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد ان کا خلیفہ کون ہو، یہ قضیہ نو روز تک نزاع کا مورد بنا رہا۔آخر میں فیصلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں ہوا۔بارہویں تاریخ کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے رسول اکرم کے ایصال ثواب کے لیے تمام اہل مدینہ کے لیے کھانا پکوایا۔تقسیم طعام کے اس سرگرم منظر کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے پرسش کی کہ اس کا سبب کیا ہے۔جواب ملا کہ آج حضور پُرنور رسول اکرمؐ کا عرس ہے۔

حضرت مخدوم نے ''خوان پرنعمت'' میں بھی ذکر فرمایا ہے کہ دہلی میں رکن الدین فردوسی قدس سرہٗ ایک جلیل القدر بزرگ تھے۔وہ پیران وبزرگان طریقت کا عرس منعقد کرتے تھے۔اس لیے خانوادۂ فردوسیہ کے بزرگوں نے اپنے پیروں کے جشن عرس کو

شوق وسرگرمی اور وفورعقیدت سے مناتے تھے۔ چنانچہ حضرت مخدوم الملک کا عرس بہار شریف کے بلخی بزرگان ہمیشہ جوش وسرگرمی کے ساتھ مناتے رہے ہیں۔ حضرت مخدوم الملک کے عرس کا منظر ابوالفیاض جونپوری کی تصنیف گنج ارشدی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس میں مخدوم الملک کے عرس کا انعقاد جس طرح مخدوم وجیہ الدین قدس سرہٗ کے زمانۂ سجادگی میں انجام پذیر ہوتا تھا، بیان کیا گیا ہے۔لیکن ''حیات ثبات'' کے مصنف شاہ نجم الدین فردوسی نے حضرت شاہ امین احمد ثبات کے عہد سجادگی میں جس شان و شوکت اور جوش وعقیدت کے ساتھ مخدوم الملک کا عرس منایا جاتا تھا اس کو بڑی وضاحت وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مکتوبات وملفوظات کے علاوہ حضرت مخدوم الملک کی تصنیفات میں متعدد رسائل وکتب بھی ہیں جن کے اسماء کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ان تصنیفات میں سے بعض کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

شرح آداب المریدین: یہ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقادر سہروردی کی معروف عربی تصنیف ''آداب المریدین'' کی شرح ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔۷۶۶ھ میں یہ کتاب مرتب ہوئی تھی۔اس کے بارے میں مناقب الاصفیا کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کتاب کی شرح ان کے معنوی اخلاف میں سے ایک شخص کرے گا۔ یہ کتاب طباعت پذیر ہوچکی ہے۔

مخ المعانی: 'مخ المعانی' حضرت مخدوم کے ۵۳؍مجلسوں کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔اس ملفوظ کے بھی مرتب مولانا زین بدرعربی ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے آغاز میں درج ذیل تحریر ملتی ہے ''کدام مخ المعانی کہ جامع وی زین العابدین بدرسمای یقین، عارف کامل حضرت زین بدرعربی کہ مرید برگزیدہ وخادم خاص مخدوم جہان است قدس اللہ سرہٗ۔''

اس مجموعہ میں لیلۃ الرغائب کی وجہ تسمیہ، ماہ رجب کے روزے کی فضیلت، مسئلۂ حدوث وقدم، مسئلہ جبرواختیار، تعبیر خواب، تزکیہ باطن، کھانے کے آداب، شہیدوں کا مرتبہ،

شب معراج، شب برات، نماز تراویح جیسے موضوعات پر حضرت مخدوم کے گرانقدر مذاکرے ہیں۔ مطبع مفید عام آگرہ کے توسط سے یہ کتاب چھپی تھی جو ایک سو اٹھاون صفحات پر مشتمل ہے۔

حضرت مخدوم جہاں نے اپنی تمام تصنیفوں میں اپنے مطالب ومفاہیم کو جالب وموثر بنانے کے لیے معروف سخنوروں کے اشعار کو مثالاً استعمال میں لایا ہے۔ وہ شعروں کو مدعا کی مناسبت سے استعمال کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ اثبات مفہوم کے لیے شعروں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ وہ ان کی تحریروں کے اجزائے لاینفک معلوم ہوتے ہیں۔ معدن المعانی اور خوان پر نعمت کے علاوہ ملفوظ زیر بحث میں بھی موقع کی مناسبت سے شعروں کا استعمال ہوا ہے،۔ مثالاً پیش کیے گئے ان شعروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا حافظہ نہایت قوی ومحکم تھا۔ مخ المعانی میں حضرت مخدوم نے معنی خیز اشعار بروئے کار لائے ہیں۔ انھوں نے بعض مجلسوں میں نخشبی کی رباعیوں کو اپنے مدعا کی تحکیم کے لیے استعمال کیا ہے۔ حضرت مخدوم ایک مجلس میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی عبادت، کار ثواب اور کرامت پر نظر رکھتے ہیں تو یہ ان کے لیے حجاب ہے۔ نخشبی نے بھی اس نکتہ کو اپنی درج ذیل رباعی میں بیان کیا ہے:

نخشبی ذکر کار خویش مکن   یار منت نہندہ یار مدان
گر بخواہی کہ کار پیش رود   کار میکن و لیک کار مدان

حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ دل آئینہ کی طرح صاف ہوتا ہے تو کوئی حجاب نہیں رہتا ہے لیکن زنگ خوردہ آئینہ دل سے جمال دوست نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ درج ذیل شعر میں سعدیؔ کہتے ہیں:

سعدی حجاب نیست تو آئینہ صاف دار   زنگار خوردہ کی بنماید جمال دوست

اسی طرح دعا کی افادیت واہمیت کو حضرت مخدوم نخشبی کی درج ذیل رباعی سے واضح کرتے ہیں:

نخشبی در دعا مکن اہمال — از دعا التماس راندہ شود
ہر دری را کہ آسمان بندد — بہ کلید دعا گشادہ شود

حضرت مخدوم کی نظر میں دنیا آخرت کا حجاب ہے اور آخرت خداوند عالم کا حجاب ہے۔درج ذیل شعر حضرت کے خیال کی تائید کرتا ہے:

دنیاست بلاخانہ وعقبٰی ہوس آباد — ما فارغ از این دو نہ آنیم و نہ اینیم

ایک مجلس میں حضرت مخدوم نے یہ ارشاد فرمایا کہ بعض مشائخ نے کفر کی تین قسمیں بتائی ہیں-کفر محمدی، کفر ابلیس اور کفر حق۔کفر حق خالص کفر ہے۔پھر کفر محمدی کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ سالک نور محمدی کا جلوہ دیکھتا ہے تو اس کو سوء تفاہم ہوتا ہے کہ یہی نور الوہیت ہے۔اسی گمان کے سبب وہ ضلالت کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔یہ مقام کفر ہے۔سالک راہ حق میں کبھی ایسے مقام پر بھی پہنچتا ہے جب وہ نور ایزدی کو ابلیس کی پُر فریب نمایشوں میں دیکھتا ہے اور اس کے مکر آمیز کرامات و کمالات کو شان الوہیت سمجھ بیٹھتا ہے تو یہ کفر ابلیس کا مقام ہوتا ہے۔

نخشبی کی دوسری رباعیاں جن کو حضرت مخدوم نے اپنے مفہوم کو مبرہن بنانے کے لیے بطور مثال اپنے اس ملفوظ میں مستعمل کی ہیں وہ بقرار زیریں ہیں:

نخشبی را وجود گہ بودست — اندرو دلبران ہلاکش کرد
عشق درمن نشان من نگذاشت — بس وجودیکہ وجد خاکش کرد

طالبان حق نام ونشان، کون ومکان سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ان کا تعلق اس جہان گزراں سے نہیں ہوتا۔حضرت مخدوم نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے نخشبی کی مندرجہ ذیل رباعی سے مدد لی ہے:

مردان رہش زندہ بجانِ دگراند — مرغان ہوایش ز آشیانی دگراند
منگر تو بدین دیدہ پریشان (کائنات) — بیرون ز دو کون و از جہانی دگرند

عاشقان الٰہی از خود رفتہ ہوتے ہیں حضرت مخدوم اس معنی کے اظہار کے لیے اوحدالدین کرمانی کے اشعار کی مثال پیش کرتے ہیں:

کاشکی دانستم کاندر جہان کیستم ۔۔۔ یاچنین سرگشتہ و حیران ز بہر چیستم
باچہ ام یادر چہ ام یا از چہ ام یا بر چہ ام ۔۔۔ دوش ازین غم تا سحر بر خویشتن بگریستم

حضرت مخدوم اس ملفوظ میں شریعت کے احکام کی پابندی کو لازمی بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شرع کی ایک حد ہے جس سے بیرون ہونا نامناسب ہے۔اگر کوئی آداب شریعت سے بے پرواہو کر کچھ کرتا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے علم وعقل میں مطابقت نہیں ہے۔شرع کے معاملہ میں علم وعقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔اس کے احکام کو تسلیم کرنا اور ان پر عمل کرنا ناگزیر ہے۔

گنج لایفنیٰ: اس ملفوظ کو بھی حضرت زین بدر عربی نے مرتب کیا تھا۔اس میں ربیع الاول ۷۶۰ھ سے ذی الحجہ ۷۶۰ھ تک کی مجلسوں کے ملفوظات شامل ہیں جو ۳۶ ورقوں پر محتوی ہیں۔اس مجموعہ کا دوسرا نام 'تحفۂ غیبی' بھی ہے۔اس میں ایک موقعہ پر امام محمد اور امام یوسف کے مکالمہ کا ذکر ہے۔ایک مجلس میں شب قدر کی علامتوں کا ذکر ہے۔ایک جگہ ہنگام مرگ انسان پر سکرات کی کیفیت جو طاری ہوتی ہے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ سکرات کا غلبہ عذاب الٰہی نہیں ہے۔ایک مجلس میں احادیث کی تقسیم وتعریف کی ہے۔ایک جگہ فرمایا کہ اولیا ۳۵۶ کی تعداد میں دنیا میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایک مجلس میں مثال کے ذریعہ آگ کو ہوا سے لطیف تر بتایا ہے۔ایک مجلس میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ فیروز تغلق جب بہار شریف آیا تھا تو اس نے مخدوم سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ایزدمتعال کا دیدار سالک کو دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے جیسا کہ صوفیا کا دعویٰ ہے۔ اگر تجلیٔ خداوند سبحان دنیا میں حاصل ہوسکتی ہے تو دنیا وآخرت میں کیا فرق ہے۔حضرت نے جواب دیا کہ آخرت میں خدا کا دیدار ظاہری آنکھوں سے ہوگا جب کہ اس عالم میں سالکان ریاضت کش خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

راحت القلوب: اس مجموعہ کے جامع بھی حضرت زین بدر عربی ہیں۔ اس میں دس مجلسوں کے ملفوظات ہیں۔ مفید عام پریس آگرہ کے توسط سے یہ مختصر رسالہ چھپ چکا ہے۔ اس کے مباحث میں رضائے حق، مبدا، معاد، متکلمین، اشراقین، سجدۂ آدم صفی اللہ، آداب تلاوت قرآن پاک، روزۂ عاشورہ، سادات کے اوصاف وغیرہ شامل ہیں۔

مونس المریدین: اس مجموعہ کے مرتب مولانا صلاح مخلص داؤد خانی ہیں۔ اس میں شعبان ۷۷۴ھ سے محرم ۷۷۵ھ تک کی مجلسوں کے ملفوظات شامل ہیں۔ اس کی مجلسوں کی تعداد ۲۱ ہے۔

اس مجموعہ کے موضوعات میں نعمت بہشت، تلقین صدق، تعریف سجادہ و صاحب سجادہ، تعریف زہد، ذکر شقاوت وسعادت، بخل واحسان، تکبر وخود بینی، ایفائے عہد وغیرہ شامل ہیں۔ اس کی مجلس چہارم میں حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ صاحب سجادہ کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ شریعت، طریقت اور حقیقت کے مراحل کو طے کر چکا ہو۔ جس صاحب سجادہ نے ان مرحلوں کو طے نہیں کیا اور وہ مصلی پر بیٹھ کر سجادگی کا دعویٰ کرتا ہو وہ صاحب سجادہ نہیں شیطان ہے۔ اس مبحث سے متعلق حضرت مخدوم نے مندرجہ ذیل اشعار استشہاد کے لیے استعمال میں لائے ہیں:

ماہ رویان تیرہ ہوشانند جاہ جویان دین فروشانند
ہمہ در علم سامری وارند از برون موسیٰ از درون مارند
از رہ شرع و شرط برگشتہ تشنۂ خونِ یکدگر گشتہ

ایک دوسری مجلس میں فرماتے ہیں کہ قاضی اپنے علم و دانش کے وسیلے سے شریعت کا نفاذ کرتا ہے۔ طمع وآز سے مبرا ہو کر اس دینی فریضہ کو انجام دیتا ہے۔ ایسے قاضی بھی ہوتے ہیں جو صاحبانِ دانش ہوتے ہیں لیکن رشوت لے کر شریعت کا نفاذ کرتے ہیں۔ اور قاضیوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو اپنی جہالت کے سبب غلط احکام کا نفاذ کرتے ہیں۔

ایک مجلس میں 'تمکین' اور مقام جیسی اصطلاحات کی توضیح کی گئی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب طالب کو مطلوب کا وصل حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اس کی صحبت میں سکون و آرامش کے حال میں ہوتا ہے۔ اس مرحلے کو تمکین کہتے ہیں۔ ندیاں بڑے جوش وخروش کے عالم میں بہتی ہیں لیکن جب یہ سمندر میں ضم ہو جاتی ہیں تو پھر اس میں جوش و ہیجان باقی نہیں رہتا۔ ان کو سکون و قرار آ جاتا ہے۔ اس نکتہ کو درج ذیل اشعار کی مثال سے واضح کرتے ہیں:

اگرچہ سیل را صد جوش باشد　　　چو در دریا رود خاموش باشد

......

رود بیک سیل بر آرد نفیر　　　بحر بصدرود شد آرام گیر

اور مقام، یہ ہے کہ جب کوئی کسی خطا کا مرتکب ہو تو وہ توبہ واستغفار کرے۔ ایک مجلس میں فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں پر سات آٹھ سو سال گزر چکے ہیں، ہم مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

سودہ گشت از سجدۂ راہ بتان پیشانیم　　　چند خود را تہمت دین مسلمانی نہم

رسالہ اشارات:

یہ رسالہ ۱۳۹ اشارات پر مشتمل ہے جو مخدوم الملک نے شیخ محمد شہباز، شیخ لامع، شیخ مراد اور شیخ ہادی اللہ وغیرہ کے نام تحریر فرمایا ہے۔ ان اشارات میں مسائل عرفان بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً عالم کی بدایت ونہایت کا مسئلہ۔ اس رسالے میں حضرت مخدوم نے خود شناسی کو خدا شناسی یا کائنات شناسی قرار دیا ہے۔

رسالہ اجوبہ: یہ چونسٹھ صفحات کا ایک رسالہ ہے۔ یہ حضرت مخدوم کے ان ایضاحات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے احباب، اعزہ اور ارادت مندوں کے سوالات پر جواباً تحریر کیا تھا۔ کچھ سوالات اس طرح ہیں مثلاً مردان غیب کون ہیں؟ وصول بہ ایزد سبحان کے لیے کون سی راہ ہے؟ اہل سلوک کی اصطلاح میں بت و زنار کا کیا مفہوم ہے؟ ان کے علاوہ حضرت مخدوم الملک کی تصنیفات میں مختصر رسالے ہیں مثلاً ارشاد الطالبین ،

ارشادالسالکین، رسالۂ مکیہ و ذکر فردوسیہ اور فوائدالمریدین وغیرہ۔ یہ مختصر رسالے ہیں لیکن ان میں بھی شریعت وطریقت سے متعلق نہایت بیش قیمت باتیں بتائی گئی ہیں۔

حضرت مخدوم الملک کے مجموعہ ہای مکتوبات، ملفوظات اور رسائل کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خداشناس صوفی تھے اور باطنی بصیرت، عرفانی تجربات ومشاہدات میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے طویل عرصے تک سخت ریاضتوں کے بعد غیر معمولی روحانی فضیلت حاصل کی تھی۔ اس کے باوصف آداب دین، احکام شریعت، فقہ، احادیث نبوی، تفسیر کلام الٰہی اور اخبار وروایات میں بھی ان کا تبحر محیر العقول تھا۔ انھوں نے انسان کے بیشتر مسائل جو دنیا وآخرت سے وابستہ ہیں کے حل کے لیے بہت مفید اور مشکل گشا ہدایتیں دی ہیں۔ وہ شریعت وطریقت کے معاملات میں توازن رکھنے کا ہنر جانتے تھے۔ عرفی شیرازی نے ایسی ہی جامع ہستیوں کے بارے میں کہا تھا:

برکف جام شریعت، برکف سندان عشق   ہر ہوسناکی نہ داند جام وسندان باختن

وہ جملہ امور طریقت میں شریعت کی پابندی کو لازمی سمجھتے تھے۔ ان کی تمام تصنیفیں احکام شریعت کو بجالانے کی تاکید وتلقین کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ خلوتکدۂ تصوف کے رازدان بھی تھے اور عرفان وایقان کے اس جہان میں ان کی شخصیت کم نظیر تھی۔ وہ خود بھی صوفیٔ باصفا تھے اور دوسرے مشائخ وابدال کا بے حد احترام کرتے تھے۔ چنانچہ عزکاکوئی اور احمد بہاری کو مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق غیر متعدل خیالات کے اظہار کے پاداش میں جب سلطنت دہلی نے انھیں گردن زدنی قرار دیا تو وہ بے حد رنجیدہ ہوئے تھے اور ان کے قتل ہوجانے پر اس واقعہ کو برملا غلط کہا تھا۔ اسی طرح منصور حلاج جن کو دار پر آویختہ کر کے قتل کیا گیا تھا ان کے انجام سے بھی وہ آزردہ وبیزار تھے۔

مناقب الاصفیا کے مصنف نے ان کے علم وعرفان کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ مخدوم الملک ہندوستان میں پہلے صوفی ہیں جنھوں نے امام احمد غزالی، امام محمد غزالی، ابن عربی، خواجہ فریدالدین عطار، سنائی اور مولانا روم کے متصوفانہ افکار و

تعلیمات اخلاقی کی تبلیغ وتشہیر کی۔ان کے آ ثار عرفان وادب کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے نہایت وقیع اور شایستۂ تحسین ہیں۔ ہندوستان میں دوسرے سلاسل کے مشائخ میں سے کسی نے دین وشریعت اور عرفان وحقیقت سے متعلق بلند معیار کے اس قدر آ ثار نہیں چھوڑے ہیں۔ حضرت مخدوم نے ان تصنیفوں میں اپنے مطالب کا اظہار نہایت سلیس و سہل زبان میں کی ہے۔ان کا اسلوب بیان بھی بہت جالب و جزیل ہے۔ دقیق وعمیق مسائل کے بیان میں بھی کہیں ژولیدگی نظر نہیں آتی۔انھوں نے اپنے موارد وموضوعات کو واضح وروشن کرنے کے لیے بڑی کثرت سے اپنی تصنیفات میں آیات کلام اللہ اور احادیث رسول کے علاوہ قصص انبیا، واقعات خلفاء وائمہ، اقوال واحوال مشائخ و بزرگان اور حکایات وتمثیلات کو بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ سخنوران معروف کی ابیات کو بھی بطور مثال اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔

حضرت مخدوم کی نثر نگاری کے کچھ نمونے بطور مثال درج کیے جاتے ہیں:

”ای عزیز! طالب را باید دانست کہ اکل وشرب بر سہ نوع است، اوّل اکل شریعت دوم اکل طریقت سوم اکل حقیقت۔ اکل شریعت آن است کہ آکل را باید در یاد رزاق بخورد و در اطاعت معبود گذراند واکل طریقت آن است کہ آکل را باید کہ ذات خود را در اکل وشرب مشاہدۂ حق تعالیٰ کند۔ زیرا چہ وجود ہیچ شی ممکن نیست الاّ بحق۔ واکل حقیقت آنست کہ بداند کہ آکل وماکول واحد است کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا من نور اللہ والخلق کلھم من نوری۔“

ایک دوسری تحریر بقرار ذیل ہے:

”حق تعالیٰ مردم را بجہت معرفت خود آفریدہ است، ہر آئینہ باید کہ ایشان را استعداد شناسائی خود دادہ باشد وگرنہ مردم

بی استعداد حق را نتواند شناخت وحق تعالی را بدین آ ثار صنعت و انوار قدرت کہ درآ فاق وانفس آفریدہ است توان شناخت ومردم را میسر نبود کہ قعر بحار وعروق جبال روند وہمگی اسرار عالم سفلی را مشاہدہ کنند و بر افلاک روند ودقائق فلکی را بدانند و در انفس عالم علوی یعنی در عالم ملکوت از احوال ارواح یعنی عقول ونفوس معلوم کنند وبرہمگی صفات حق تعالیٰ مطلع شوند وافعال اوتبارک تعالیٰ بدانند۔''
(مراۃ المحققین)

حضرت مخدوم کی نثر نگاری کے محسنات ان کی مناجات میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی مناجات کے اقتباسات بطور مثال نقل کیے جاتے ہیں:

''الٰہی انت ربی وقوی انا عاجز ،الٰہی انت مالک وانا مملوک،الٰہی عاجز ترین عاجزانم ،الٰہی جاھل ترین جاہلانم ،الٰہی نمی دانم تا رضای تو جویم ، الٰہی نمی دانم تا چہ گویم ، الٰہی عجز و درماندگی من تو می بینی ، الٰہی حاجت من تو دانی ، الٰہی من بیچارہ و عاجز ہیچ حیلہ و قوت ووسیلہ ندارم وآنچہ جز تُست از آن بیزارم ، الٰہی من ضعیف و درماندہ راومن نحیف درھای راندہ راومن مدہوش سیاہ کاروگنہ گار راومن بدکردار راومن انقیاد فرمان شیطان راومن استاد مکتب عاصیان راومن مدہوش سرگشتہ راومن عاجز دربدرگشتہ راومن گنہگار بدافعال راومن خاکسار بداعمال راومن ثابت ناتمام راومن عہد شکن خودکام راومن گندم نمای جوفروش راومن زناردار خرقہ پوش را ومن سیاہ رونامہ سیاہ راومن منافق تبہ کار را بہ فضل عمیم ولطف قدیم خود از بند نفس امارہ خلاصی دہ توبہ نصوحا عطا کن کہ طاقت حضرت عدل تو ندارم ، الٰہی مرا توفیق دہ کہ ترا پرستم کہ بی توفیق تو ترا

نتوان پرست ۔ الٰہی مرا تعریف دہ کہ ترا بشناسم کہ بی تعریف تو ترا نتوان شناخت ، الٰہی ضائع کردم عمر خویش بر آن چیز کہ رضای تو نبود و من ندانستم از آن توبہ کردم و بیزار گشتم ۔

ای دستگیر ہر شکستہ وای دلیل ہر درماندہ وای فریادرس دشوارھا، ای چارہ ساز بیچارگان وای قبول کنندۂ توبۂ عاصیان وای پذیرندۂ گریختگان وای حلیمی کہ حلم تو مارا گستاخ کرد وای رحیمی کہ رحم تو مرا بیباک گردانید، این گستاخی و بیباکی از ما عفوکن واز خلعت معرفت ہمہ اعضای مارا بپوشان ۔

الٰہی بحق طفیل تہلیل و تسبیح و تحمید جملہ روحانیان و کروبیان ، الٰہی بحرمت عابدان و زاہدان الٰہی بحرمت خاصگانِ درگاہ تو ، الٰہی بحرمت لواحقان حضرت تو ، الٰہی بحرمت عزیبان شہادت جوانان ، الٰہی بحرمت آبدیدۂ عاصیان ، الٰہی بحرمت عفو توبۂ عاصیان درگاہ تو الٰہی بحرمت عزۂ جلال تو الٰہی بحرمت عظمت وکمال تو کہ حاجات من و جملہ مسلمانان رواکنی وایمان مارا در دنیا و آخرت بر ما ارزانی داری ۔ الٰہی چون در آن حجرۂ تنگ وتاریک و بی شمع مارا ابتلاکنی ایمان مارا چراغِ لحد گردانی ۔"

از مکتوبات صدی ۔ در بیان شریعت وطریقت:

"برادر شمس الدین بداند کہ شریعت راھی است کہ انبیا علیہم السلام میان امت نہند بتائید خداوند عزوجل ۔ دعوت ھمہ انبیاء خلایق را اول بہ توحید بود و در این ھمہ انبیا برابر اند، بلکہ یک دین است و یک دعوت و یک معبود ۔ جملہ متفق بودہ اند از عہد آدم تا بعہد محمد مصطفیٰ صلوات اللہ علیہم در سخنان ایشان ہیچ

خلاف نبود کہ دعوت بہ محض وحی خداوند بودہ است کہ حق تعالیٰ بواسطۂ جبرئیل علیہ السلام در عقول وسمع ایشان منقوش و سموع گردانیدہ است۔

شریعت بیان توحید وطہارت ونماز وروزہ وحج وجہاد وزکوٰۃ ودیگر احکام شرع ومعاملات است۔ اما طریقت طلب کردن بحقیقت این معاملات است وتفحص کردن این شروعات وآراستن اعمال بصفاء ضمایر وتطہیر اخلاق است از کدورات طبع چون ریا وہوا وجفا وشرک ومانند این۔

در جملہ ہر چہ بہ تہذیب وتطہیر ظاہر تعلق دارد شریعت است وہر چہ بہ تصفیہ وتزکیۂ باطن تعلق دارد طریقت است۔ مثلاً جامۂ نمازی کردن از لوث نجاست شریعت است ودر پاک کردن از کدورات بشریت طریقت است۔ پیش از نماز وضو کردن شریعت است وہمیشہ بوضو روی دل بحق آوردن طریقت است۔ در جملہ ہر چہ مرتبۂ حواس فرود آید، رعایت کردن آن از شریعت است۔ وہر چہ درون پردۂ قالب است رعایت کردن آن طریقت است۔

ہر کہ بی شریعت قصد طریقت کند ہمچنان باشد کہ کسی بر بالای بام خواہد شدن وراہ نردبان آن بام خراب کند۔ وہمچنان باشد کہ کسی بہ حیلۂ بسیار سنگی وبہ ہوا برمی انداز دو جہد تمام نماید ورنج بسیار کشد وہر چہ بمدتی بر بالا انداز دوبہ کمتر ساعتی فرود افتد وبمنزلِ خود باز آید۔ وہمچنان باشد کہ کسی خواہد بہ حج رود پشت بہ مغرب آرد واز کعبہ اعراض کند ومیرود۔ اگر چہ سالہای بسیار ہم بر آن قاعدہ رود ہرگز بکعبہ نرسد کہ ہر مقصدی را راہی است وہر قصدی را شرطی

است ـ و ہر صحبتی را اہلیتی و نسبتی است و شرط و نسبت راہی طریقت
جملہ احکام شریعت است ـ والسلام

در ذکر محبت:

برادر شمس الدین بداند،مخلوقات دیگر را با محبت کار نبود
کہ ہمت بلند نداشتند کار ملایکہ کہ راست بنی از آن است کہ
با ایشان حدیث محبت نرفتہ است واین زیروزبری کہ درراہ آدمیان
می بنی از آنست کہ با ایشان حدیث محبت رفت کہ (یحبہم ویحبونہ)۔
پس ہر کہ راشمۂ از محبت بمشام اور سیدہ است گو دل از سلامت
بردار وخود را وداع کن چون نوبت و دولت آدم در آمد وخروشی و
جوشی در مملکت افتاد، گفتند چہ افتاد کہ چندین ہزار سال تسبیح وتہلیل
مارا بباد دادند وآدم خاکی را برکشیدند و بر ما گزیدند، نداشنیدند کہ شما
بصورت خاک منگرید بدان ودیعت پاک بنگرید کہ (یحبونہم ویحبونہ)
آوردہ اند کہ جمیلہ ای در حسن و جمال ثانی نداشت ۔
روزی چون آفتاب در بازار بغداد پدید آمد شور وشغب درمیان
خلق افتاد ـ ہر کسی پی او دویدند ـ او بخانہ در آمد و در بست ـ گفتند
چون خود را یکی بار نخواہی داد ،این نمودن چیست؟ گفت
شوروغوغای عالم دوست می دارم آسمانیان سرگردان و زمینیان
سراسیمہ وحیران ـ بی او کس را قرار نہ وکس را بدو بار نہ ـ ہر روز
چندین بار عرش کرسی را میگوید (ہل عندک اثر) کرسی عرش را
میگوید (ہل عندک خبر) ـ آسمان زمین را گوید (ہل ربک طالب)
زمین آسمان را گوید (ہل سافر فیک عاشق) ای برادر در ہر گوشہ او
را کشتہ ایست و در ہر زاویہ اوراسوختہ ای ـ کدام جانست کہ گداختۂ

قہر او نیست و کدام دل است کہ نواختۂ لطف او نیست۔ سبحان اللہ
ہفت صد ہزار سال برآمد و ہر روز فروغِ این آتش تیز تر است۔

ای برادر دولت آب و خاک نہ اندک است و کار آدم و آدمیان نہ مختصر۔ عرش و کرسی و لوح و قلم و آسمان و زمین ہمہ بہ طفیل اوست۔ استاد ابو علی گفت اگر آدم را خلیفہ گفت و خلیل را اتخذ اللہ ابراہیم خلیلا گفت و موسیٰ را واصطنعتک لنفسی گفت ما را یحبہم و یحبونہ گفت۔

محبان گفتہ اند کہ این عالم و آن عالم ہر دو برای طلب است۔ اگر کسی گوید کہ آن عالم عالم طلب نیست، این محال است۔ فردا ہمہ شرائع را قلم در کشند اما این دو چیز را ابد الآباد بماند۔ الحب للہ والحمد لہ۔ احکام حج و جہاد و نماز و روزہ رواست کہ منسوخ گردد۔ چون در بہشت روی ہر روزی کہ بر تو گذرد از شناخت حق سبحانہ تعالی بر تو عالمی گشادہ گردد کہ پیشش از آن نبودہ باشد و این کاری است کہ ہرگز بسر نیاید و مبادا کہ آید:

تا من بزیم پیشہ و کارم اینست
آرام و قرار و غمگسارم اینست
روزم اینست و روزگارم اینست
جویندۂ صیدم و شکارم اینست

حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ:

شاہ شعیب فردوسی مخدوم جلال منیری کے فرزند تھے۔ ۱۱ر ربیع الاول ۶۸۸ھ میں اپنی نانیہال قریہ کجاوان، جو پٹنہ ضلع میں آج بھی موجود ہے متولد ہوئے۔ موصوف، مخدوم جہان حضرت شرف الدین احمد منیریؒ کے عم زاد بھائی اور خلیفہ بھی تھے۔ حضرت

شعیبؒ کی عمر ابھی صرف سات سال کی تھی کہ ان کے والد ماجد شیخ جلال کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جد مادری حضرت شیخ ابوبکر نے ان کی پرورش کی۔ جب جوان ہوئے تو معشوق حقیقی کا جذبۂ عشق ان پر مستولی ہوا اور دیدارِ جلوۂ محبوب کی طلب ایسی صادق تھی کہ بے اختیار و بے قرار ہو کر جستجوئی حق میں خانمان چھوڑ کر اس علاقے کے جنگل میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور ایک طویل عرصے تک مجاہدہ اور مراقبہ میں مستغرق رہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ حضرت مخدوم الملک نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنا پیرہن، دستار، پٹی اور قینچی وغیرہ حضرت مولانا مظفر بلخی کے حوالے کر کے یہ وصیت کی تھی کہ یہ چیزیں حضرت شعیب کو دے دی جائیں۔ اس وقت حضرت شعیبؒ جنگل میں ریاضت کش تھے۔ مخدوم الملک کے وصال کے بعد مولانا مظفر عدن کے لیے عازم سفر ہوئے تو انھوں نے مخدوم الملک کے مطہر تبرکات کو حضرت نوشہ توحید کے سپرد کر دیا تھا جن کو حضرت نوشہ توحید نے اپنے فرزند حسن دائم کی معرفت شیخ شعیب کے پاس شیخ پورہ ارسال کر دیا۔ لیکن شیخ شعیبؒ نے مخدوم الملک کے ان تحائف کو سجادۂ مخدوم سے اجازت وخلافت ملنے کے بعد ہی قبول فرمایا۔ حضرت شعیب کی تاریخ وفات ۸۲۴ھجری ہے۔ ''محرم حق شعیب ولی'' سے تاریخ وفات مستخرج ہوتی ہے۔

''مناقب الاصفیا'' کے علاوہ حضرت شعیب کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ لیکن یہ نثری کارنامہ ایک گراں قدر تذکرہ صوفیہ ہونے کے باوصف زبان اور طرز بیان کے مکارم کا بھی آئینہ دار ہے۔ ان کی اس کتاب مستطاب کے کچھ نمونے یہاں پر نقل کیے جاتے ہیں۔ ذیل کی عبارت میں پیر سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا گیا ہے:

> ''واعتقاد در لغت چیزی در دل گرفتن وقرار دادن باشد و پیش این طایفہ محبت پیران است کہ از سودای دل مرید سر بر زند و کلیۂ دل او را متوجہ ومشغول عظمت پیر گرداند و این لطیفہ ایست ربانی تا کدام صاحب دولت را روزی کند۔ ہر کہ اعتقاد یافت ہمہ یافت وآنکہ نیافت چہ یافت۔''

اقتباس ذیل میں سید المرسلین سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت و تحسین کے بیان کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

''آن سلطان انبیا، آن قہرمان اتقیا واصفیا، آن مقصود وجود عالم، آن مطلوب ز آفرینش آدم، آن راوی روایت روی قلبی عن ربی، آن والی ولایت لا نبی بعدی، آن مسافر عالم اسریٰ، آن مقیم مقام دنی فتدلی، آن رازدار اسرار ما اوحی، آن واصل قبۂ قاب قوسین او ادنیٰ، آن سید الاولین والآخرین آن خاتم الانبیاء والمرسلین ...... آنکہ وجود موجودات طفیل وجود او بلکہ ظہور مکنونات قطرہ ای از دریای او، مہتری کہ جمیع کائنات برای او بود وخدای تعالی خود در ثنای او بود۔''

مولانا آموں:

حضرت مولانا آموں مخدوم جہان شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے گرامی قدر خلیفہ تھے۔ ان کے بزرگوں کا وطن اصفہان تھا۔ ان کے خانوادہ کے بزرگوں میں سے ایک شخص موسوم بہ عبداللہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں واقع قصبہ چوسہ میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے۔ اس زمانے میں چوسہ، ایالت بہار کے انتظامی امور میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت آموں کے والد حضرت ابراہیم جو مخدوم جہان کے ارادت مندوں میں سے تھے موضع ''چروانوان میں'' جو شیخ پورہ جہاں حضرت شعیبؒ کا مرقد اقدس ہے سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ایک قدیم بستی ہے، مقیم ہو گئے۔ حضرت مخدوم جہان جب بھی اپنے چچا زاد بھائی شاہ شعیب سے ملاقات کے لیے شیخ پورہ کا سفر کرتے تو راستے میں واقع اس بستی میں حضرت ابراہیم سے ملاقات کے لیے ٹھہرتے تھے۔ اس طرح حضرت آموں کو مخدوم کے شیخ پورہ کی مسافرتوں سے مستفیض ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ حضرت آموں نے مخدوم کے حضور میں تعلیمات کی تکمیل کی اور ان کے

دست پُر میمنت پر ارادت کا پیمان باندھا۔ پھر تمام عمر کی خدمت میں رہ کر ان کی علمی و روحانی برکتوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔

حضرت مخدوم جہاں ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مخدوم کو اس دیار کے حاکم نے جو جائیداد ہدیۃً نذر کی تھی اسے حضرت نے مولانا آموں کو بخش دیا۔

حضرت آموں تصوف کے نکات و اسرار سے واقفیت رکھتے تھے، چنانچہ حضرت مخدوم کے انوار باطنی سے جو روشنی ان کے نصیب میں آئی، اس کی برکتوں سے آپ کے ملفوظات کے دو مجموعے معرض تحریر میں آئے۔ "تحقیقات المعانی" اور "ملفوظ المبارک"۔ تحقیقات المعانی کے جامع آپ کے فرزند مولانا ارزانی ہیں جب کہ "ملفوظ المبارک" کو آپ کے پوتے حضرت شاہ مبارک نے ترتیب دیا تھا۔ ایالت بہار کے متصوفانہ ادبیات کے درمیان حضرت آموں کے مندرجہ بالا آثار نہایت وقیع ہیں۔ یہ ملفوظات ان کے علمی تبحر اور باطنی بصیرت کے شاہد ہیں۔ یہاں پر کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

مولانا آموں ذکر نفی و اثبات اور کثرت استغنا سے متعلق اپنی فکر و نظر کا اظہار کرتے ہیں:

> "مجلس دوم نہم ماہ رجب المرجب بعد نماز فجر و فراغ وظائف دائمی حضرت مخدومنا مقبولنا بر سجادۂ مبارک جلوس فرمود۔ جمیع طالبین در مجلس حضور پُر نور شرف حاصل نمودند، ذکری در بیان ذکر نفی و اثبات کلمہ است و آن مختار و معمول اکثر مشائخ است، بقولہ تعالیٰ یصلح لکم اعمالکم ویغفر لکم ذنوبکم و مراد از قول شدید کلمۂ لا الٰہ است نزدیک جمہور مفسران و بقولہ علیہ الصلوات والسلام افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ و ذکر لا اللہ الا اللہ را سلطانی عظیم است، اگر بجز دنشان باشد کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ و صادقان متقدم چون در دل غباری یافتند سہ بار کلمہ لا الٰہ الا اللہ بذوق وشوق می گفتند، غبار دور می شد و پردہ برمیداشتند و در مشاہدہ می شدند، استغفار و توبہ بسیار

برای رفع حجاب قلب اشارت است کہ مومن بہ استغفار وتوبہ
مشغول شودلانہ توبۃ اصل الکل عبادۃ وبکلمہ سہ بار گفتن رفع حجاب
قلب میشد کہ درکلمہ چنین قوت از ینجاست کہ یکبار گفتن کلمۂ طیب
ایمان حاصل شود۔''

حضرت آموں کی وفات ۴ رشعبان کو۸۷۴ھ میں ہوئی۔ موضع چروانواں میں ہی حضرت کا مزار مبارک ہے۔

مخدوم سلطان احمد چرمپوش:

مخدوم احمد چرمپوش مستقیماً سلسلۂ فردوسیہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔سلسلۂ سہروردیہ،فردوسیہ جس کی ایک شاخ ہے میں مرید تھے۔حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰ منیری کے خالہ زاد بھائی تھے اوران کے ہم عصر تھے اور بہار شریف ہی میں ارشاد وہدایت کے مبارک کاموں میں مشغول رہے۔سلسلۂ فردوسیہ کے معروف بزرگ مولانا مظفر بلخی کے والد ماجد حضرت مولانا شمس بلخی ان کے مرید وخلیفہ تھے۔اس لیے بہار کے مشائخ فردوسیہ کے ساتھ حضرت احمد چرمپوش کا تذکرہ بےمحل نہیں ہوگا۔حضرت چرمپوش کا نام سید احمد اور لقب چرمپوش اور تیغ برہنہ تھا۔ان کا وطن ہمدان تھا۔والدمحترم کا نام موسیٰ ہمدانی ہے۔ان کے بزرگوں کا تعلق تخت شاہی سے رہا تھا۔اپنے والد کے بعد اورنگ نشین ہوئے۔لیکن طبیعت درویشانہ تھی۔بادشاہی پسند نہیں آئی۔تخت سلطنت کوچھوڑکرسفر اختیار کیا اور مختلف مقامات میں گردش کرتے ہوئے تبت پہنچے۔اوروہاں کے غیر مسلم حکمراں سے نبرد آزما ہوئے۔ جنگ میں فتح حاصل ہوئی۔ وہاں سے ہندوستان کے لیے عازم سفرہوئے اور سیوان سے گزرتے ہوئے بہار شریف میں وارد ہوئے۔اور یہاں تبلیغ دین مبین اور اصلاح وارشاد کے کام میں مشغول ہوگئے۔ حضرت احمد چرمپوش ایک عظیم المرتبت صوفی تھے۔اس کے ساتھ ہی شعروادب کے میدان میں بھی ان کی خدمات نہایت گرانمایہ ہیں۔فارسی زبان کے صاحب دیوان

شاعر تھے اور ایک ملفوظ موسوم بہ ضیاء القلوب ان کے ذکر وفکر کا نتیجہ ہے۔ یہ ملفوظ ۱۳۲۰ھ میں مطبع محمود المطابع'' کانپور سے شائع ہو چکا ہے۔ مخدوم چرمپوش کے مرید علاء الدین علی بن ابراہیم الصوفی اس ملفوظ کے جامع ہیں۔ یہ نو ابواب پر محتوی ہے جس میں ۵۸ صفحات ہیں۔ مرتب مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''امابعد میگوید فقیر حقیر بندۂ درویشان بلکہ خاکپای ایشان علاء الدین علی بن ابراہیم الصوفی کلمات چند از شیخ الطریقت مرشد حقیقت حضرت پیر دستگیر خود یعنی شیخ المشائخ واولیا بدر الزہاد والتقیاو مربی الفضلاء مجمع المعانی نعمان الثانی سراج الحق والحقیقۃ والشرع والدین بندگی حضرت مخدوم شیخ احمد چرمپوش تیغ برہنہ قدس اللہ سرہ العزیز کہ از اقوال پیران طبقات وطالبان این راہ کہ خود را در زمرۂ اہل تصوف دارند ونظر در عدم وجود خود کنند واین مختصر را ''ضیاء القلوب'' نام نہادہ شد بہ ابواب تسعہ تحریر افتاد، ھذا فہرست الابواب المذکورہ، باب اول در شناختن خود وطلب علم، باب ثانی در سیر کردن وصحبت گرفتن، باب ثالث در شناختن نفس علوی وسفلی، باب رابع در خلوت بعضی واز خلق بریدن وباب خامس در یافتن خود باطبع مختلف، باب سادس در معرفت روح ونفس وعقل، باب سابع در شناختن پنج حواس وقبض کردن، باب ثامن در حیرت سکتہ حاصل آمدن، باب تاسع در اخلاص بودن وصبر کردن۔''

''ضیاء القلوب'' ایک مختصر رسالہ ہے لیکن اس کی ادبی ومعنوی حیثیت مسلم ہے۔

حضرت احمد چرمپوش فارسی کے ایک گرامی قدر شاعر تھے۔ ان کے دیوان کا نسخۂ خطی کتابخانۂ خدا بخش میں موجود ہے اور ایک نسخہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات

میں بھی ہے۔ یہ دیوان 'دیوان احمد جام ژندہ پیل' کے نام سے نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا جس میں احمد جام ژندہ پیل کی بھی غزلیں شامل ہیں۔ ان کے کچھ اشعار نمونتہً نقل کیے جاتے ہیں:

تا عشق نہادست درین سینہ اساسی — واللہ کہ مرا از دل وجان نیست ہراسی
دیوانہ بجز بادلِ دیوانہ نسازد — الجنس مع الجنس توان کرد قیاسی
بیزارم از این طایفۂ عاقل و ہوشیار — با فرقۂ نا اہل مرا نیست مساسی
این آئینہ دوست نما ہر کہ بہ بیند — در راہِ یقین ست ہمون راہ شناسی
مردم بود آنکس کہ درو معرفتی نیست — مردم نتوان گفت بعینی و براسی
ماحق چو بہ بنیم و شناسیم حقیقت — زان چشم نہادند برآن پنج حواسی
آن را کہ دل و دیدہ دراین راہ ندیدند — بیچارہ فروماندہ گرفتار ایاسی
گہ صورت مجنون و گہی پیکر لیلیٰ — محبوب دلم آمدہ ہردم بلباسی
احمد زرہ ترک چو تجرید گرفتہ — سرمایۂ خودساختہ چرمی و پلاسی

مولانا مظفر شمس بلخی:

مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی فرزند سلطان شمس بلخی، بلخ کے معروف صوفی حضرت ابراہیم ادھمؒ کے اخلاف میں سے تھے۔ جنھوں نے تاج وتخت سے دست کش ہو کر درویشی اختیار کر لی تھی۔ حضرت مظفر شمس بلخی کے پدر محترم سلطان شمس بلخی بھی شاہزادہ تھے۔ انھوں نے بھی اپنے اسلاف کے عالی مقام بزرگ حضرت ابراہیم ادھم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پادشاہی کی شوکت وعظمت سے مستغنی ہوکر اپنے خانوادہ کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ یہاں دہلی میں سکونت پذیر ہوکر کچھ مدت تک سلطان محمد تغلق کی ملازمت سے وابستہ رہے لیکن اعیان سلطنت میں سے کسی ایک کے غیر شایستہ سلوک سے بددل ہوکر شاہی ملازمت ترک کردی اور فقیرانہ زندگی کو اپنا شعار بنالیا۔ اور روحانی رہنما کی تلاش میں مختلف اطراف کا سفر کرتے ہوئے بہار شریف پہنچے۔ یہاں

حضرت احمد چرم پوش جو اس دیار کے معروف وممتاز صوفی تھے، کی ارادت مندی سے مشرف ہوئے۔ یہاں حضرت موصوف نے دائمی طور پر مقیم ہو کر دہلی سے اپنے اہل و عیال کو بھی بلا لیا۔

سلطان شمس بلخی کے تین فرزند تھے۔مظفر، معزالدین اور قمرالدین۔ برہان الدین مظفر جو سلطان شمس کے سب سے بڑے بیٹے تھے کا تولد آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں بلخ میں ہی ہوا تھا۔ جس وقت سلطان شمس بلخی کا خانوادہ دہلی سے بہار شریف کے لیے عازم سفر ہو رہا تھا حضرت مظفر ایام جوانی سے گزر رہے تھے۔ 'سیرت الشرف' کے مصنف کے قول کے مطابق مولانا مظفر ۷۵۵ھ یا ۷۵۶ھ میں حضرت شرف الدین احمد کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

مولانا مظفر بلخی جب دہلی سے بہار شریف کی مسافرت اپنے افراد خانوادہ کے ہمراہ طے کر رہے تھے تو راستے میں جون پور کے قریب ظفر آباد میں کچھ دنوں تک اقامت گزیں رہے۔ ظفر آباد کی مختصر مدت کی سکونت میں حضرت مظفر کے خانوادے کے روابط وہاں کے مقامی ساکنوں سے استوار ہوئے تھے۔ چنانچہ معزالدین کے فرزند حسین نوشہ توحید کی ولادت ظفر آباد میں ہی ہوئی تھی۔ بہار شریف میں اس خانوادے کے ورود مسعود کے بعد معزالدین نے اپنے والد کی اتباع کرتے ہوئے حضرت احمد چرمپوش کو اپنا ہادی و مرشد بنایا۔ لیکن حضرت مظفر بلخی کی شخصیت فضل وکمال سے متصف تھی۔ وہ ایک ایسے رہنما کی جستجو میں تھے جو ان کی علمی اور روحانی دونوں طرح کی نیازمندیوں کی تکمیل کے لیے ارشاد و رہنمائی کا موجب بن سکے۔

چنانچہ علم وعرفان کے مکارم سے آراستہ شخصیت انھیں حضرت مخدوم شرف الدین احمد کی ذات اطہر واقدس میں نظر آئی۔ اور آخر کار وہ اس پیر روشن ضمیر کے نہایت مخلص و معتبر مرید بن گئے۔ حضرت مخدوم نے انھیں از سر نو حصول علم وعرفان کی تلقین کی کیونکہ حضرت مخدوم کے خیال میں ان کا تحصیل کردہ علم ناقص اور ناقابل اعتبار تھا۔ مرتبۂ کمال

تک پہنچنے کے لیے انھیں علوم الٰہی سے باخبر ہونا لازم تھا۔ چنانچہ اپنے پیرومرشد کی ہدایت پر اپنے علم کی تکمیل کے لیے وہ دہلی پاپیادہ روانہ ہوگئے۔ راستے میں صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ دہلی میں مولانا مظفر دوسال تک مقیم رہ کر اکتساب علوم عرفانی میں مشغول رہے۔ ایک روز وہ اپنے خلوت کدہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مطربوں کا ایک طائفہ وہاں پہنچا۔ ان نوازندوں نے ایک ایسا نغمہ چھیڑا کہ وہ ازخود رفتہ ہوگئے اور عالم جذب وشیفتگی میں وہ دریچے سے زمین پر کود گئے اور جملہ اسباب وسامان کو مسکینوں کے درمیان تقسیم کر کے اپنے پیرومرشد سے دوبارہ ملاقات کے لیے بہار شریف کے سفر کے لیے شتابان رہسپار ہوئے۔ مولانا اپنے دینی علوم اور عرفانی وروحانی روشنی کی بنا پر اپنے پیر کی نظر میں نہایت محبوب ومحترم تھے اور امتداد وقت سے دونوں مشائخ کے مابین محبت ومودت کا یہ رشتہ استوارتر ہوتا گیا۔ ان کو خود بینی وتکبر کے احساسات سے محفوظ ومبرا رکھنے کے لیے اور ان کی طبیعت میں انکسار وفروتنی کی کیفیت کو راسخ کرنے کے لیے حضرت مخدوم نے خانقاہ کے فقراء کی خدمت ونگہداری کی ذمہ داری ان کے حوالے کی۔ جسے انھوں نے بڑے شوق وسرگرمی کے ساتھ انجام دیا۔ اپنی پُر خلوص خدمات اور صادقانہ اطوار و اعمال سے مولانا مظفر حضرت مخدوم کے مریدوں میں سب سے زیادہ عزیز اور مورد توجہ تھے۔ جب کبھی مولانا حضرت مخدوم کی خدمت میں شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہوتے تو حضرت اپنی نشستگاہ سے اٹھ کر چند قدم چل کر احتراماً ان کا استقبال کرتے تھے اور ان کی علمی لیاقت اور روحانی بصیرت کی اس درجہ ان کے دل میں قدر وقیمت تھی کہ انھوں نے مولانا سے درویش کی صفات ومختصات کی بابت کچھ معرض تحریر میں لانے کا استدعا کیا۔ مولانا نے اپنے پیر کی ہدایت کے مطابق اس فریضے کو بخوِ احسن انجام دیا۔ صرف دوبار ایسے مواقع ظہور میں آئے جب حضرت مخدوم کو مولانا مظفر سے عارضی طور پر شکر رنجی پیدا ہوئی۔ اوّل بار جب ایک علمی موضوع پر مباحثہ ومذاکرہ میں مولانا مظفر اور بہار کے چند ذی علم ارباب کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ طویل جرح وبحث نے سرانجام

مرارت ورنجش کی صورت اختیار کر لی۔ طیش وخشم کے حال میں مولانا مظفر نے کچھ علمائے بہار کے خلاف کچھ دل آزار کلمات استعمال کیے۔ ایسے رنج آور اشارت مناقشے کا سبب بن گئے۔ علمائے بہار نے ان کے خلاف شکایت پیش کی۔ مولانا مظفر نے اس نزاعی مسئلہ سے متعلق اپنے نظریے کی حمایت میں ایک مضمون تحریر کر کے حضرت مخدوم کے تحتِ ملاحظہ رکھا اور اسے اپنے ساتھ لے کر شکایت کا جواب دینے کے لیے علماء کے نزدیک جانے کی اجازت طلب کی۔ حضرت مخدوم مولانا کے اس ارادے سے بہت برافروختہ ہوئے اور نوشتہ مضمون کے کاغذ کو پارہ پارہ کر دیا اور اظہار خیال فرمایا کہ مومن کو ایسے نزاعی مسئلوں میں الجھنا نہیں چاہئے۔ یہ ایک لاحاصل تفرقہ انگیز، مباحثہ ہے۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت مخدوم کی آزردگی کا سبب مولانا مظفر کا ایک بیزار وبددل کرنے والا جواب تھا جو انھوں نے حضرت شیخ منہاج الدین کو دیا تھا۔ شیخ منہاج الدین سات مرتبہ حج بیت اللہ سے شرف یاب ہو چکے تھے لیکن حضرت مخدوم کو سوء اتفاق ایک بار بھی زیارت حرمین شریفین کا موقع نہیں ملا تھا۔ حضرت منہاج الدین اکثر درمیان گفتگو اس صورت واقعہ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ ایک بار حسب سابق حضرت منہاج الدین نے اس کا ذکر کیا تو حضرت مظفر نہایت بدحظ ہوئے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ حضرت مخدوم کو مولانا مظفر کا ردعمل ناگوار گزرا اور وہ اس درجہ دلتنگ ہوئے کہ تین دن تک مولانا مظفر سے گفت وشنید نہیں کی۔ لیکن ایسی عارضی رنجشوں سے مولانا مظفر کے تئیں حضرت مخدوم کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ حضرت مخدوم کے دل میں مولانا مظفر کی تعظیم وتکریم کا استنباط اس طرح ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانۂ حیات میں ہی مولانا مظفر کو اپنا روحانی وارث نامزد کر دیا تھا۔ اس امر سے متعلق حضرت مخدوم نے ایک اجازت نامہ مولانا مظفر کے حوالے کیا تھا جس کی واقفیت حضرت کے دوسرے مریدوں کو نہیں تھی۔
جب حضرت مخدوم کا وصال (۶ رشوال ۷۸۲ھ) ہوا اس وقت مولانا مظفر حج خانۂ خدا کو انجام دینے کے بعد اپنے واپسی سفر میں عدن میں مقیم تھے۔ حضرت مخدوم کی وفات

حسرت آیات کی اطلاع ملتے ہی وہ بلا تاخیر بڑی سرعت سے بہار شریف کے سفر پر روانہ ہوئے۔ یہاں ان کی عدم موجودگی میں حضرت مخدوم کی رحلت کے بعد ان کے مریدین صاحب سجادہ وخلیفہ کے فرائض انجام دے رہے تھے اور لوگوں کو مرید بنانے کی رسم وراہ پر عمل پیرا تھے۔ جب مولانا مظفر بہار شریف پہنچے تو خاصانِ خانقاہ مخدوم کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ دوران مذاکرہ مولانا مظفر نے دریافت کیا کہ کس جواز کے مطابق انھوں نے خلافت وسجادگی کے کام انجام دیے ہیں۔ خانقاہ کے مشائخ نے اس عمل کے موجبات بتائے اور ساتھ ہی مولانا مظفر سے گزارش کی کہ اگر ان کے پاس ایسی اجازت کا کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں۔ مولانا مظفر نے جواب دیا کہ اس سے متعلق حضرت مخدوم کا ایک اجازت نامہ ان کے پاس ہے جو حضرت نے سفر حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل ان کو عطا کیا تھا۔ سارے مریدوں نے مولانا مظفر کے بیان کو صدق و صمیمیت کے ساتھ تسلیم کر لیا اور کمال عزت و احترام کے ساتھ وہ مسند سجادگی پر تشریف فرما ہوئے۔

مولانا مظفر کے مکتوبات سے جو انھوں نے متعدد سالکان طریقت اور رہروان جادۂ حقیقت کے نام تحریر کیے ہیں ان سے ایسے اشارے ملتے ہیں کہ مولانا مسند سجادگی پر متمکن ہونے کے بعد ایک طویل مدت تک بہار سے بیرون مختلف شہر و دیار کی سیاحت کرتے رہے۔ انھوں نے حضرت مخدوم کے دوران حیات بھی بہت سارے ملکوں اور علاقوں میں گشت کی تھی۔ حضرت مخدوم کی وفات کے بعد بیشتر اوقات میں وہ بہار شریف سے باہر رہے۔ بہار میں ان کے دوستوں اور ارادت مندوں کو مولانا کی عدم موجودگی کا شدید غم تھا۔ وہ دایماً ان سے التجا کرتے کہ وہ بہ تعجیل بہار لوٹ آئیں اور اپنے پیر و مرشد کے مرقد مطہر پر اقامت فرمائیں۔ لیکن مولانا مظفر صرف اپنے پیر کی آرامگاہ کی مجاورت میں رہنے کے لیے بہار واپس آنے کو درخور توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مختلف مقامات میں گھومتے رہتے تھے اور کبھی بھی ایک جگہ پر مستقلاً سکونت پذیر نہیں ہوتے تھے۔ ان کے

خیال میں ایک جگہ سے دائمی طور پر وابستہ ہونا صوفیوں کے لیے مناسب نہیں تھا۔

اگر چہ مولانا مظفر نے اپنا پہلا حج حضرت مخدوم کے دوران حیات میں ادا کرلیا تھا لیکن دوبارہ حج کو جانے کی آرزو ان کے دل میں تڑپ رہی تھی۔ وہ اسی سرزمین پاک میں مدفون ہونا چاہتے تھے۔ اس نیک مقصد میں معاونت کے حصول کے لیے وہ سلطان غیاث الدین کے پاس سنارگاؤں مشرقی بنگال چلے گئے۔ مولانا مظفر ۸۹۸ھ کی حدود میں سنارگاؤں پہنچے تھے۔ سلطان غیاث الدین ایک ہنر پرور حکمراں تھا۔ شاعروں اور دانشوروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ صوفیہ ومشائخ کی تعظیم وتکریم ذوق وتوجہ کے ساتھ کرتا تھا۔ معروف فارسی شاعر حافظ شیرازی کو بڑی آرزومندی سے بنگالہ آنے کی دعوت دی تھی، اگر چہ ناموافق حالات کے سبب حافظ بنگال کا سفر نہیں کر سکے تھے۔ سلطان نے مولانا مظفر کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور اپنے محل سرا میں شاہی مہمان کا رتبہ دیا۔ مولانا کو اگر چہ بلا تاخیر حج خانۂ خدا کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن بنگال کی آب وہوا انھیں راس نہیں آئی۔ وہ علیل ہوگئے اور چار مہینوں تک ذی فراش رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد مولانا نے سلطان سے سفر حج کے انتظام کے لیے درخواست کی۔ لیکن کچھ ایسے نامساعد حالات ظہور میں آتے رہے کہ دو سال تک مولانا مظفر کو وہاں رکنا پڑا۔ لیکن اس اثنا میں سلطان نے مولانا کو بڑی محبت وتکریم کے ساتھ رکھا۔ مولانا نے کئی مکتوبات میں سلطان غیاث الدین کے محبت آمیز سلوک اور ان کے ادبی ذوق کا ذکر کیا ہے۔

ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مولانا مظفر کی قربت سے مستفیض ہونے کے لیے انھیں مزید روکنا چاہتے تھے لیکن مولانا بہ تعجیل تمام حج بیت اللہ کے لیے عازم سفر ہونا چاہتے تھے۔ مولانا کے پیہم استدعا سے مجبور ہوکر سلطان نے ان کے سفر حج کے لیے متعلق کارمندوں کے نام فرمان جاری کردیا اور آخر کار مولانا مظفر چاٹگام پہنچ کر زیارت کعبہ کے ارادے سے بحری سفر پر روانہ ہوگئے۔ مولانا مظفر دیار مقدس میں چار برسوں تک مقیم رہے۔ وہاں طلبا کی تدریس وتعلیم اور عبادت خدائے متعال میں وہ مشغول

رہتے تھے۔اسی اثنا میں وہاں ان کے بھائی کا انتقال ہوا تھا۔ بھائی کی موت کے صدمے سے غمزدہ ہوکر مولانا مظفر اپنے برادرزادہ حسین معز کے ہمراہ عدن چلے گئے۔اسی مقام پر ۳ر رمضان المبارک ۸۰۳ھ کو ان کا وصال ہوگیا۔

مولانا مظفر کے ادبی آثار میں اہم ترین تصنیف جو ہنوز موجود ہے ان کے مکتوبات کا مجموعہ ہے جن کی ترتیب وجمع آوری ان کے برادرزادہ حسین معز کے کاروکوشش کا نتیجہ ہے۔ مولانا کا دوسرا ادبی اثر ان کے اشعار کا دیوان ہے۔اس کے علاوہ مولانا نے بدایت ونہایت درویشی کے تحت عنوان ایک مختصر رسالہ لکھا تھا۔ تین پیغمبروں کی بابت جو سلاطین بھی تھے، ایک مختصر مضمون بھی ان کی ادبی باقیات میں شامل ہے۔ مولانا نے کچھ ایسی چیزیں بھی تصنیف کی تھیں جواب ناپید ہوچکی ہیں۔ مثلاً شرح عقائد نسفی ،اور مشارق الانوار کی شرح وتوضیح۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا ،مولانا کی عالی مقدار تصنیف ان کا مجموعہ مکتوبات ہے۔ یہ مکتوبات تصوف کے رموز وغوامض کے درک وفہم کے لیے نہایت مفید ومعاون ہیں۔ان مکتوبات میں مولانا نے اپنے شرح وبیان کو آیات قرآن مجید اور احادیث نبوی سے آراستہ کیا ہے۔ اسلوب نگارش نہایت سہل وسلیس ہے۔ ہندی بھاشا کی شاعری کے کچھ اودھی لہجے بھی ان کے بعض مکتوبات میں ملتے ہیں۔

مولانا مظفر بلخی فردوسی شاعر بھی تھے۔انھوں نے اشعار فارسی کا ایک مختصر دیوان بطور یادگار چھوڑا ہے۔ان کے دیوان کے مطالعہ سے متصور ہوتا ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے شاعر تھے۔ان کے اشعار میں صوفیانہ افکار سے متعلق تلویحات و اشارات میں تصوف کے وہ نکات ومسائل جو انھوں نے اپنے مکتوبات میں بیان کیے ہیں وہ ایجاز واختصار کے ساتھ منظوم پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان شعروں کی معنوی قدر وارزش اپنی جگہ پر مسلم ہے۔لیکن یہ اشعار فنی محسنات سے عاری ہیں اور ان میں شعری کیفیت کا فقدان ہے۔ ان میں فکر وفن کا وہ امتزاج مفقود ہے جو قاری کے ذہن وقلب میں ہیجان واضطراب پیدا کرتا ہے۔ افکار

عارفانہ ہیں، نہایت ارفع واعلیٰ ہیں لیکن زبان وشیوۂ بیان جاذب و جالب نہیں ہیں۔مولانا نے جن متصوفانہ افکار کو اپنے مکتوبات میں شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے وہ ان شعروں کے وسیلہ سے کنایہ آمیز انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ذیل میں مولانا مظفر بلخی متخلص بہ برہان کی چند غزلیں مثالاً مندرج کی جاتی ہیں:

سرّی میان ما وشما درالست رفت — وآن سر بہر دلی کہ دمید ندمست رفت
دی زاہدی کہ دامن عصمت بدست داشت — امروز چاک کرد وگریبان زدست رفت
بالا گرفت چون بدلم کار عشق نیک — آہستہ مست عقل بدآموز پست رفت
ہر کو بغیر عشق بسر برد عمر اگرچہ — صد سال کرد طاعت،ہم بت پرست رفت
جز عشق تو بہ برہان دیگر حرام باد — سرّی میان ما وشما در الست رفت

....

ہر زمان داغ دلم را نو بہاری دیگر است — زانکہ اندر گلستانم گلعذاری دیگر است
زاہدان اندر جہان خود کارشان دارند لیک — پاک باز راہ او را کاروباری دیگر است
مرد عاشق را پرستم زین جہان وآنجہان — زانکہ او زین ہر دو برتر درشماری دیگر است
گر جہان را سربسر نقش ونگارستان کنند — درمیان جان ما نقش ونگاری دیگر است
درکنار مطرب او چنگ را خوش نالہ ہاست — درکنار عشق ما از راز زاری دیگر است
گرچہ ترکان را شکاری ہست درصحرا ولیک — تارک صحرای وحدت را شکاری دیگر است
ساقیا زین رجس شیطان جام ما را پرمکن — آن دگر می دہ کہ برہان را خماری دیگر است

....

ہر کو مراد خواہد از یار خام باشد — جز عشق عاشقان را دیگر حرام باشد
ہر کو نخورد جامی از عشق ناتمام است — جامش خور و برون رو تا عشق تام باشد
تا تو زخود نزائی وصلش ز تو نزاید — از کام خود برون رو تا جملہ کام باشد
گر تیر غم فرستد او خاص بردل ما — برمن گدا از آن شہ این لطف عام باشد
سامان کار برہان از ما محال بینی — ہر کو نظام عشق است او بی نظام باشد

....

چون بکوی عشق دل چالاک شد　　عقل را دامن دوصد جا چاک شد
ہین نماز عشق کن درکوی دوست　　جامۂ دل از ہوا چون پاک شد
آتش عشقت بہ دل ناگہ فروخت　　سوخت و دفتر ہای عقلی خاک شد
پاکباز عشق را از جان چہ باک　　ہر کہ در عشق آمد او بی باک شد
در دل برہان چو عشقت شعلہ زد　　علم و فضلش جملگی خاشاک شد
من جدا شبہا تیم جانم جدا　　ای بخاک کوی تو صد جان فدا
عشق رویت خانہ ام ویران کرد　　خرگہی چون مفلس بی خانہ را
شد نشاط خواب شبہایم حرام　　دیدۂ مشتاق را خواب از کجا
در پیش شد سالہا برہان ترا　　عمر دادی درہوای کیمیا

....

حدیث عشق او گفتن دلا شور و فغان آرد　　براہ عاشقان رفتن خرابی خانمان آرد
سخن در عشق میگوئی و در خود ماندہ ای ہی ہی　　سخن در عشق او گوید کہ خود را درمیان آرد
تو در پاکی و بی باکی قدم بالا ترک برنہ　　کہ تارک بر درِ غیری زمین وآسمان آرد
ہمیشہ لیلی و لیلی ز مجنون بر زبان رفتی　　چو مجنون جملہ لیلی شد کہ لیلی بر زبان آرد
درون پردہ حسن او بلا ہا می کند چندین　　اگر او پردہ بردارد خرابی در جہان آرد
تو بسم اللہ بگو بگذر چو مردان اسیر او　　دریغا چون کنم گویند وغیری درمیان آرد
نگارا دامن عشقت بجان تو کہ نگذارم　　اگر چہ جور ہجران تو برہان را بجان آرد

....

مرغ ہوای جانان باغ و چمن ندارد　　سر دوست ہر کہ دارد سر خویشتن ندارد
قلاش راہ وحدت در کوی پاکبازی　　مال و منال و خانہ فرزند و زن ندارد
جانان زخود دہدمی مطرب چو عشق باشد　　تن ہمچو چنگ عاشق خبری زتن ندارد
بسرِ غم تو جانان کہ غم تو ہر کہ دارد　　دوجہان بروفشاند کہ غم کفن ندارد
دیروز کز تن من جان بردھجر رویت　　اکنون بجز غم تو بندہ بہ تن ندارد

بویی کہ میدہم من از زلف او بعالم　　　واللہ چنین ز بوی مشک ختن ندارد
جانا بہ ہجر عشقت برہان وجود خود را　　　اکنون کہ شست فکر غسل و کفن ندارد

....

ہرمو بود زبان برای کلام عشق　　　گوش است ہرمسام برای پیام عشق
ماچون زجسم خود برہ دوست خاستیم　　　در گوش مارسید زہر سو سلام عشق
درعشق باختیم دل و جان ولی ہنوز　　　شرمندہ میشویم کہ گیریم نام عشق
دریک قدم زہر دو جہان پاک بگذرند　　　مردان برآورند بہ ہمت چو گام عشق
بوم ہوا خرابۂ شہوت کند قرار　　　عنقای ہمت تو کہ پرّد ببام عشق
ز اقبال شاہ عشق گذشتیم از دو کون　　　آزاد ہر دو کون بباید غلام عشق
در بحر کون عشق چو انداخت دام را　　　معدود جانِ چند فتادہ بدام عشق
برہاںؔ چوہستئ تو نہنگ عدم برد　　　می نوش چون نہنگان دریا بکام عشق

مولانا مظفر بلخی نے بھی اپنے پیرومرشد کی طرح فکر انگیز و بصیرت افروز مکاتیب کا ایک گرانمایہ مجموعہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ جن کی تعداد شاہ نجم الدین فردوسی مصنف ''حیات ثبات'' کی تحریر کے مطابق دوسو ہے۔ لیکن معین الدین دردائی ''تاریخ سلسلۂ فردوسیہ'' کے مصنف ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کی کل تعداد ایک سو اٹھاسی بتاتے ہیں۔ مولانا مظفر کے ان مکاتیب میں تصوف وعرفان، فلسفہ وعلم کلام، احکام شریعت اور حدیث وقرآن کے مباحث ملتے ہیں۔ ان کے چند مکتوبات کی تلخیص یہاں پر پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً پہلے مکتوب میں توکل و یقین کے مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مکتوب ظہیر الدین کے نام ہے۔ ہدایت فرماتے ہیں کہ باقیماندہ زندگی کے ایام کو آخرت کا توشہ بناؤ اور جب تم نے درویشی کے مسلک کو پسند کیا ہے تو ضروری ہے کہ درویشوں کے اطوار وخصایل کی پیروی کرو۔ فقراء توکل کی راہ پر چلتے ہیں اور انھیں یقین کامل ہوتا ہے کہ قسام ازل نے روزی انسان کو تقسیم کر دی ہے اور ہماری کوششوں سے

اس میں کاہش وافزائش نہیں ہوسکتی۔لہٰذا ایسی چیز کی طلب میں سعی کرنی جومقسوم ومقدر بن چکی ہے یکسر لاحاصل ہے۔

ایک دوسرے خط میں مولانا نے علوئے ہمت کو ہدف ملاحظہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سالکان طریقت جستجوئے حق میں دیوانے ہوتے ہیں۔عشق الٰہی میں عقل و خرد سے بیگانہ ہوجانے والے ان شیداووارفتہ لوگوں کی ثمین ترین دولت ان کا غم عشق ہے۔ وہ اس غم عزیز میں دایماً مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔دنیا کا طرب ونشاط ،مسرت وشادمانی اُن کے لیے درخور اعتنا نہیں ہیں۔ وہ ابدی ماتم میں رہتے ہیں،معشوق ازلی سے جدائی کی بدنصیبی کے الم میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اپنے اپنے احوال واعمال کے ناقص، ناکافی اور موجب ننگ وندامت ہونے کا بھی حسرت و ملال رہتا ہے۔لیکن رہروان جادۂ حق کی یہ بدنصیبی ایسی ہے کہ دنیا کے اقبال مند لوگ ان غمزدہ بدنصیبوں کی جوتیوں کی خاک کو سرمہ بنانے کی آرزو رکھتے ہیں اور ایک بات جس پر جملہ علماء واولیا متفق ہیں وہ یہ ہے کہ مرد کی قیمت اس کی ہمت ہے اور جس کی ہمت کا گھوڑا زمان ومکان کی حد سے آگے نہیں بڑھتا دراصل وہی بدبخت ہے اور آخرت میں بھی محرومی و مایوسی اس کے حصہ میں رہے گی۔

مولانا مظفر بلخی نے متعدد مکاتیب سلطان غیاث الدین فرمان روائے بنگال اور وزیر اعظم ہمایوں خاں کے نام لکھے تھے۔بطور نمونہ ایسے دو خط ان کی اصلی صورت میں نقل کیے جاتے ہیں:

> ''مکتوب صد وشصت ودوم درعبارت کلمات دیوانگان و بیان بزرگیٔ شیخ شرف الدین پانی پتی بجانب خان ہمایون دستور۔
> بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔سلام ودعا تعریض کردونمودہ آمد۔ در پانی پت شیخ شرف الدین پانی پتی بود کہ سی سال طعام نخورد و وقتی یخنی و جغرات پیش او بردندی باری یخنی در جغرات تر کردی بجوشید و

بیرون انداختی ۔ گویند آن یخنی ہر کہ خوردی دیوانہ شدی ۔ وقتی مکتوبی بر سلطان علاء الدین نوشتہ بود برین عبارت کہ علاء خوطی ۔ این حکایت درزمین مامعروف ومشہوراست ۔ برکسی پوشیدہ نیست این غزل شیخ راست، سہ بیت مرایاد بود آن اینست ۔ ابیات

روز باخوش پسران نرد دغامی بازم　　شب ہمہ شب بشرابی وشمع می سازم
زملامت چہ گزیداست کہ عاشق بکشم　　زجلاجل چہ گزیداست کہ من شہبازم
بازبرکوی شرف مدعیان کورشوند　　روز باخوش پسران نرد دغامی بازم

ای دوست مردی سی سال طعام نخورد اورا باخوش پسران ونرد و شراب چہ نسبت است وہم چنین گویند کہ درمستیہای عالم خود دوات وقلم وکاغذ خادم دائم پیش داشتی ۔ قلم برگرفتی وہم چنین ہا نوشتی بعدہٗ کاغذ را پارہ پارہ کردی بہ شگاف دیوار ہا خلانید از آنجا معتقدان بیرون میآوردند ونسخہ میکردند ہمچنین چند غزل جمع شدی چنانچہ غزلی دیگرمی نویسند:

خراباتی شدم مستانہ جامی　　نمی دانم حلالی یا حرامی
نمازی میگزارم در خرابات　　کہ در وی نہ رکوعی نہ قیامی

ای دوست روح چون ازمضیقِ عالم ناسوت بہ علوے عالم ملکوت ترقی کند اورا ازبادیۂ عشق ومحبت مست کنند۔“

مکتوب صد و پنجاہ ویکم درشراب شوق وتوجہ نمودن با اہل ذوق بجانب سلطان غیاث الدین پادشاہ ہندوستان ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ فقیر حقیر مظفر شمس سلام ودعاء رسانید ۔ فرمان ہمایون رسید کاتب برمضمون ملائم جواب نتواند نوشت کہ دست وقلم زبون دل سوداز دہ شیدای ست ودرفرمان شاہ کہ مشحون ومملوانواع

دُر جواہر معانی این رباعی بود۔

ای مست شراب ذوق باطن سرخوش نہ مدام شوق باطن
یک جرعہ بکام این گدا ریز ای خسرو جوق جوق باطن

اگرچہ ہشیار بودم مرا این رباعی مست کرد ای دوست این مدام مدام نبود۔ احیانا بعد اللیا والتی تا جرعہ از این کی دھند و بکہ دھند و ہرچہ روندہ از نہاد خودگامی بیشتر نہد و راہ موتوا قبل ان تموتوا پی سپر کند این جام وصراحی بدو قریب تر رسد:

عاشقان در رہت ہمہ سرمست عقل در آستین و جان در دست
یک قدح خوردہ بر رخ ساقی آنچہ آن نیست کردہ در باقی

اگر عبارت آسمانیان و زمینیان یکتنہ کند و بداند کہ علت یافت این است خام بود و در ''قوت القلوب'' شیخ ابو طالب برد اللہ مضجعہ، آوردہ است کہ امام شافعی پیش شیبان راعی نشستی و از مشکلات خود سوال کردی و روش سلوک از او استفسار کردی و گفتی کیف یفعل ھٰذا وکیف لا یفعل ھٰذا از خدمت شیخ سماع دارم کہ شیبان راعی را نشستگاہ میان مزبلہ بودی۔ امام حنبل آنجا رفتی و بزانوی ادب پیش او نشستی و تبرک گرفتی رجب مزین شیخ بامداد آئینہ بدست شیخ دادی، شیخ روی مبارک دران بدیدی بعد از نقل شیخ آئینہ نیک نیک محبوب ومطلوب دل این بیچارہ بود پیدا نمی شد، درین روزھا بعد از سالہا آن آئینہ کسی بہ بیچارہ آورد، نعمتی بس بزرگی وتبرک عظیم بود۔ ہمان آئینہ بحضرت شاہ ارسال کردہ شد۔ این نعمت وبرکت شاہ راارزانی بود۔ وروشنائی ہادہد............انشاءاللہ طفیل آن آئینہ ودستار وبار اینکہ روز جمعہ پوشیدہ بودم فرستادہ ام۔''

''مناقب الاصفیا'' میں مذکور ہے کہ مخدوم جہاں کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان میں چالیس ارادت مند ایسے تھے جو وصل حق تعالیٰ کے درجہ کو پہنچ چکے تھے۔ ان چالیس مریدوں میں تین بشمول مولانا مظفر بلخی نہایت اہم تھے۔ حضرت مخدوم جہاں اپنے دو خلیفہ شیخ نصیر الدین اور مولانا مظفر بلخی سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ مولانا مظفر بلخی کا حضرت مخدوم اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب وہ ملاقات کے لیے آتے تو مخدوم دروازے تک پہنچ کر ان کا استقبال کرتے تھے۔ لیکن ایسی شفقت اور احترام واکرام کے باوجود دو مرتبہ اپنے نہایت عزیز ارادت مند سے رنجیدہ ہوئے تھے۔ ایک بار کرامت کے مظاہرہ پر اور دوسرے مرتبہ علمائے بہار سے مناظرہ کرنے پر۔

''مناقب الاصفیاء'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم جہاں راجگیر میں ریاضت کش تھے تو مولانا مظفر بھی کچھ دنوں کے لیے ان کے ساتھ تھے۔ اور ایک حجرہ ان کے لیے متعین کر کے انھیں اربعین میں بٹھلا دیا۔ ابھی چلّہ کی مدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک قوال نے مولانا مظفر کے حجرے کے باہر درج ذیل اشعار کو ترنم کے ساتھ پیش کیا :

کیش مارسم شکستن نبود عہد وفا را	اللہ اللہ تو فراموش مکن صحبت مارا
درایں دیار گذشتی وسالہا بگذشت	ہنوز بوی تو می آید از منازلہا

قوال کی اس آوازہ خوانی کو سن کر حضرت مظفر بے قرار ہو گئے اور اس درجہ مغلوب الحال ہو گئے کہ مستی وبیخودی کے عالم میں چلّہ توڑ کر حجرے سے باہر نکل آئے۔

حضرت مولانا مظفر بلند ہمت بزرگ تھے۔ اپنے جذبۂ صادق اور پیر کی رہنمائی سے انھوں نے طریقت کے مقامات کو طے کیا۔ مال ومتاع اپنے پاس رکھنا ناروا سمجھتے تھے۔ گھر میں مال ومتاع اگر ہوتا تو اسے لٹوا دیتے تھے۔

حضرت زین بدر عربی:

حضرت زین بدر عربی کے کاروکوشش سے ہی مخدوم جہان شرف الدین احمد

یحییٰ منیری کے افکار صوفیانہ سے سالکان طریقت اور جویندگان حقیقت متعارف ہو سکے۔حضرت مخدوم کے آثارِ ادب وعرفان سے متعلق جو ملفوظات ،مکتوبات، کتب و رسائل دستیاب ہیں ان میں سے بیشتر کے مرتب، کاتب اور خاص و عام کے درمیان ان کو مشتہر کرنے والے حضرت زین بدر عربی ہی تھے۔لیکن جائے افسوس ہے کہ جس شخص نے اپنی مساعی جمیلہ سے حضرت مخدوم جہان اور ان کے آثار میں مذکور بہت سارے مشائخ عظام کے احوال اور ان کے کمالات وفضائل سے ہم واقف ہو سکے،ان کے ذاتی حالات کی بابت ہم بہت کم جانتے ہیں ۔ چودہویں صدی عیسوی میں ادبی آثار کی مخصوص اصناف ،مکتوبات وملفوظات جو بہار میں دیگر مقامات کی نسبت زیادہ متداول رہیں،ان کو سالم وثابت رکھنے میں حضرت زین بدر عربی کی کاوشیں درخورِ تحسین ہیں۔

حضرت مخدوم کے بارے میں مناقب الاصفیا کی مختصر اطلاعات سے قطع نظر اس زمانے کی تحریر کردہ مذہب وتصوف کی کتاب میں کچھ نہیں ملتا۔ حالانکہ حضرت مخدوم کے ارادت مندوں کی تعداد کثیر تھی۔ ان کے بعد کی صدیوں میں جو ذرائع معرض تحریر میں آئے وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ خادم حضرت مخدوم جہان جو ان کے ادبی آثار کے مرتب تھے کو بھی کسی نے لائق توجہ نہیں سمجھا۔لیکن ان کی خدمات نہایت وقیع ہیں۔ ان کی طبیعت میں فروتنی اور شکستہ نفسی بہت زیادہ تھی۔ وہ آثار مخدوم جن کے وہ مرتب رہے ہیں اپنے آپ کو بیچارۂ مسکین ،سگ درگاہ، گدای ژندہ پوش، خادم مخدوم جہاں، جیسے کلمات سے خطاب کرتے ہیں۔

زین بدر کی سرگذشت حیات پردۂ خفا میں ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ بہار شریف میں آج خود کو حضرت زین بدر کے اعقاب واخلاف میں شمار کرتے ہیں وہ بھی ان کی بابت کوئی معتبر اطلاع نہیں رکھتے ہیں ۔ بہر حال زین بدر سے متعلق کچھ ضمنی اطلاعات ،معدن المعانی، گنج لایفنیٰ ،ملفوظات الصفر اور تحفۂ غیبی میں ملتی ہیں۔تحفۂ غیبی میں ۲۲ رذی الحجہ ۷۶۰ھ کے تحت ایک واقعہ ملتا ہے کہ جمعہ کے روز فجر کی نماز کے بعد زین بدر پیر کی خدمت میں ایک طشت لے کر جس میں پان اور کچھ شیرینی تھی حاضر

ہوئے اور زمین پر اپنا سر رکھا اور حضرت مخدوم کو یہ اطلاع دی کہ خداوند کریم نے انھیں ایک بیٹا عطا کیا ہے۔ پھر انھوں نے حضرت سے اس کے نام وکنیت کے لیے التماس کی۔ حضرت مخدوم نے اس کا نام قمر الدین رکھا۔

اسی طرح ملفوظ الصفر میں ۶ ربیع الاول ۷۶۲ھ کی تاریخ کے تحت ایک واقعہ میں 'انشاء اللہ' کے استعمال کے جواز میں حضرت امام شافعی کی رائے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس وقت وہ پانڈوا (بنگال) میں مقیم تھے۔ ۲۳ صفر ۷۶۲ھ کے تحت ایک واقعہ اس طرح ہے کہ جب وہ چھ مہینے سولہ دن کی اقامت کے بعد بنگال سے واپس ہوئے تو انھوں نے اپنے پیرومرشد سے ملاقات کی۔ حضرت نے ان سے فیروز شاہ تغلق کے ہجوم کے سبب وہاں کے باشندوں کے درمیان پھیلی ہوئی ناامنی، عدم سکون اور بے اطمینانی کے بارے میں سوال کیا تھا۔ یہ فیروز شاہ تغلق کی بنگال پر دوسری بار کی لشکر آرائی کا واقعہ ہے۔

اس ملفوظ میں ۲۷ صفر ۷۶۲ھ کے تحت زین بدر اور ان کے پیر حضرت مخدوم کے مابین امساک کے موضوع پر ایک دلچسپ مکالمے کا ذکر ہے۔ اس مجلس میں قضا وقدر کا بھی موضوع زیر بحث رہا۔ اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ یزید بن معاویہ کو لعنت ونفرین کا مورد بنانے کی طرف منتقل ہوگیا۔ حضرت مخدوم نے فرمایا کہ یزید بن معاویہ یا رسول کریم کے کسی صحابی پر لعنت نہیں بھیجنی چاہیے۔ لیکن حضرت زین بدر اس مسئلہ سے متعلق اپنا مخصوص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ضمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مجرم اور قاتل جگر گوشۂ رسولؐ پر آخر لعنت کیوں نہ بھیجی جائے جس نے خواتین خانوادۂ مقدس کو اسیر بنایا اور دشت کربلا میں انھیں اپنے جور وستم کا نشانہ بنایا۔

حضرت زین بدر فضل وکمال سے آراستہ تھے اور علوم متداول میں ایک موقر حیثیت رکھتے تھے۔ سخن گوئی کا بھی نہایت لطیف ذوق رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی شعری تخلیقات کی مقدار بہت کم ہے۔ ان کے کچھ اشعار ان کے مرتبہ ملفوظات مخدوم مانند 'تحفۂ غیبی'، معدن المعانی'، 'گنج لایفنیٰ' اور خوان پر نعمت کے مقدمات یا ترقیموں کے ضمن

میں ملتے ہیں۔ایسے کچھ اشعار مثالاً درج کیے جاتے ہیں:

این بحرالٰہی ست ودراین کان معانی ست	اینجا ہمہ قوت دل و ہم قوت جانی ست
اینجا ہمہٗ سر الٰہی و دگر نیست	اینجاہمہٗ وحدت صرف ست وخبر نیست
اینجا ہمہ خیری کہ درین شرّ نیابند	اینجاہمہ نوش است دلانیش نیابند
دری طلسم زین کہ بدارین نگنجد	عیشی طلسم زین کہ درو زین نگنجد
در ہردو جہان خادم مخدوم جہان دار	او را بعموم کرم ای پیر جہاندار

حضرت زین کا ترتیب دیا ہوا اولین ملفوظ جو مفصل ترین بھی ہے ''معدن المعانی'' ہے جس کا مطبوعہ نسخہ پانچ سوصفحات پر محتوی ہے۔اور یہ ۶۳ ابواب میں منقسم ہے۔یہ ملفوظ ۷۴۶ھ تک کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔''خوان پر نعمت'' جو ۷۴ مجلسوں پر محیط ہے اس کا توسیعی حصہ ہے۔اس کی ضخامت کم ہے اور یہ ۱۵رشوال ۷۴۹ھ سے لے کر ۷۵۱ھ کے ماہ شوال تک کے ملفوظات مخدوم پر مشتمل ہے۔'مخ المعانی' کے اندرونی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مرتب بھی حضرت زین بدرعربی ہیں۔ان کے علاوہ ''گنج لایفنیٰ''، 'ملفوظ الصفر''،اور''تحفۂ غیبی'' کے جامع بھی حضرت زین بدر ہیں۔

حضرت زین بدر مخدوم جہان سے بہت سارے شرعی، فقہی، عرفانی اور قرآنی مسائل سے متعلق حضرت کے ذکر و بحث کی مجلسوں میں متجسسانہ سوالات کرتے تھے جس کے شافی وکافی جوابات مخدوم جہان بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ دیتے تھے۔ان مختلف النوع سوالات میں ذات وصفات، زن وشو کے مابین حبہ، معیّت، کسب، خضوع، زہد، لعنت یزید، مشیّت، ارادت، صحو، سکر، رویت جیسے موضوعات ہوتے تھے۔ حضرت زین بدر کی نثر نگاری کا ایک نمونہ جو مکتوبات صدی کے دیباچہ کی صورت میں ہے ذیل میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

''سپاس بی پایان وستایش فراوان مرحضرت کبریائی را
کہ دلہای عارفان را بانوار مشاہدۂ جمال باکمال ومکاشفۂ جلال لایزال

آراستہ گردانید و ہمہ وقت در نظارۂ عجائب وغرائب اسرار غیبی مستغرق و مدہوش داشت و ہردم در جام جان ایشان شراب باصفای تجلیّات پیاپی ریختن فرمود تاچنان مست شوند کہ ایشان را از ایشان بر بود و نور شہود احدیت پیش چشم مردم دیدۂ سرایشان جلوہ داد وخودرا بدین شان بی نشان بنمودتا درغلبات ظہور آن نور خودرا و خلق راوجان راوجہان رادر ناپیدائی و نابودگی تصور کردند، ندیدند مگر ہمو و نرفتند مگر بدو، نگرفتند مگر از او و نگفتند مگر بہ او۔

وصد ہزاران افضل صلوٰۃ واکمل تحیات بر جان پاک آن سرورِ عاشقان وتاج سر عارفان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باد کہ کسوت نبوت در بر انبیا بہ طفیل اوزیبا آمد وخلعت ولایت بر تن اولیا بہ صدقۂ او چست گشت۔ اگر او نبودی کہ بودی۔ نہ فلک بودی نہ ملک۔ واگر او نیامدی کہ آمدی نہ آدم آمدی نہ آدمی۔ ورسولی کہ بہ مکان درمقام قربت کرامت صد ہزاران ہزار تشریف محرمیت بی اطلاع ملکی و نبی و مرسلی و ولیؔ برقامت مبارکش ارزانی فرمود وخیمۂ جلالت ویرا درصحرای وجود کون نصب کرد و در بارگاہ کونین وجود مخلوقات را خدم او ساخت۔ ونفحات فیضان تسلیمات وتحیات بر آل واہل بیت ویاران او کہ ہر یک پیش آن بدر منیر ستارگان درخشان و سیارگان نور افشان بودند و بر علمای شریعت و پیران طریقت و بلغای حقیقت کہ میراث داران اویند خصوصاً الطاف ونعم مشاہدہ واضاف شمیم مکاشفہ از جناب ازل و درگاہ لم یزل نثار وقت مولانا ومخدومنا استادنا وشیخنا ومرشدنا الانام الی طریق اللہ السلام

قطب الاقطاب ،سلطان العارفین شرف الحق وحقیقت والہدیٰ والدین احمد یحییٰ منیری متع اللہ المسلمین بطول بقاء ہ وادام اللہ المسلمین نعمۃ لقاء ہ متواتر ومتوالی باد۔''

حضرت حسین نوشہ توحید بلخی:

مولانا مظفر بلخی کے شرح احوال وآثار کے ضمن میں اس امر کا ذکر ہو چکا ہے کہ بہار میں بلخی صوفیوں کے بنیان گذار مولانا شمس الدین بلخی تھے۔مولانا شمس الدین بلخی دہلی سلطنت کے کسی موقر عہدے پر مامور تھے۔ایک بار دیوان حکومت کے کسی منصب دار نے مولانا شمس الدین کو نفرت آگیں نگاہ سے دیکھا۔حضرت کو اس شخص کی یہ قبیح حرکت بہت ناپسندیدہ معلوم ہوئی جس کے سبب بلاتاخیر دہلی کی شاہی ملازمت ترک کر کے بہار کے لیے عازم سفر ہوئے جہاں وہ حضرت احمد چرمپوش کے دست پر فیض پر ارادت کا پیمان باندھا۔اور کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت شمس الدین بلخی کے خانوادے کے جملہ افراد جن میں ان کے تین بیٹے مولانا مظفر بلخی ،معزالدین بلخی اور قمرالدین بلخی کے علاوہ ان کی اہلیہ بھی شامل تھیں بہار شریف کوچ کر گئے ۔حضرت مولانا مظفر کو کوئی اولا دنہیں تھی۔ان کا خاندانی سلسلہ ان کے بھائی معزالدین سے قائم رہا۔معزالدین، حسین نوشہ توحید کے والد ماجد تھے اور مولانا مظفر بلخی ان کے حقیقی چچا تھے جس کے سایۂ عاطفت میں حسین نوشہ توحید نے آموزش وپرورش کے مراحل گزارے۔حضرت حسین نوشہ توحید خانوادۂ مشائخ بلخ کے ایسے سعادت مند چشم وچراغ تھے جنھیں دوجلیل القدر خدارسیدہ بزرگوں، مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری اور حضرت مولانا مظفر بلخی سے اکتساب فیوض وبرکات کے مواقع ملے تھے۔

حسین نوشہ توحید کا تولد ظفرآباد (ضلع جون پور، اتر پردیش) میں ۷۶۰ھ کی کسی تاریخ میں ہوئی تھی۔ان کی تاریخ ولادت تحریری شہادت دستیاب نہ ہونے کے سبب قطعی طور پر معلوم نہیں ہے۔یہ فیروز شاہ تغلق کی سلطانی کا زمانہ تھا جو دہلی کے تخت

پر ۷۵۲ھ سے ۷۹۰ھ تک متمکن رہا۔ نوشہ توحید کا اسم گرامی شیخ حسین معز شمس ہے۔ نوشہ توحید ان کا لقب تھا اور حسین تخلص کرتے تھے۔ بہار کے سلسلۂ فردوسیہ میں مخدوم شرف الدین احمد اور مولانا مظفر بلخی کے بعد نوشہ توحید ایک ایسے باکمال بزرگ تھے جو ایک صوفی باصفا اور اہل معرفت ہونے کے ساتھ ایک ارجمند دانشور بھی تھے جن کی شخصیت جملہ علوم متداول سے آراستہ تھی۔ وہ ایک جید عالم دین تھے اور مولانا مظفر نے انھیں سند حدیث عطا کی تھی۔ نوشہ توحید کی حیات کا ایک طویل عرصہ حضرت مخدوم شرف الدین اور مولانا مظفر کی بامیمنت صحبتوں میں گزری تھی اور وہ متصلاً فضل و دانش اور مسائل ومفاہیم تصوف کا اکتساب ان بزرگوں سے قریب رہ کر کرتے رہے۔

حضرت نوشہ توحید کو یہ سعادت بھی حاصل تھی کہ وہ مولانا مظفر بلخی کے اسفار میں بھی ان کے ہمراہ رہے تھے۔ وہ مولانا کے سفر حجاز میں ان کے ساتھ تھے۔ وہ مخدوم شیخ شرف الدین کے ارادت مند اور اپنے عم حقیقی مولانا مظفر کے خلیفہ تھے۔ جس وقت مولانا مظفر کا وصال عدن میں ہوا تھا نوشہ توحید وہاں ان کے ساتھ تھے۔ شدید علالت کے ایام میں نوشہ توحید ہمیشہ ان کی خدمت ونگہداری میں مشغول رہتے تھے۔ ان دنوں جب وہ بستر مرگ پر آخری سفر کے لیے منتظر تھے نوشہ توحید کو اپنے پاس بلا کر نصیحت فرمائی اور بہار شریف کی سجادگی کے لیے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ مولانا مظفر نے اپنے برادرزادہ کے ذہن وقلب کے اوصاف پسندیدہ کا ذکر بشرح ذیل کرتے ہیں:

> ''فقیر حقیر مظفر شمس عامۂ مسلمانان را سلام ودعا می رساند و باز نماید فقیہ حسین معز شمس برادرزادۂ این فقیر است۔ حق سبحانہ وتعالیٰ ویرا گرامی کردہ فرزند صالح ومتقی است۔ قریب چہار سال در مکۂ مبارک بود۔ قرأت قرآن ومشاطبی پیش شمس الدین خواری درون کعبہ کردہ قرأت سبعہ پیش شمس الدین حلوائی در مقام ابراہیم پیش در کعبہ گذاشتہ وشیخ شمس الدین مذکور در عصر خود یگانہ

روزگار است۔ در حلب و شام و مصر و مدینہ مصطفیٰ ومبارک در علم
قرأت ویرا نظیری نیست وجای شیخ مجاور حرم است ۔فرزند حسین
مذکور سندِ حدیث برین فقیر کردہ صحیح مسلم وصحیح بخاری من اولہ وآ خرہ
لفظاً و معناً برین فقیر تحقیق کردہ۔ خدای تعالیٰ ویرا ذھن صافی و
طبیعت فیاض دادہ است وسند دیگر بر خطیب عدن نیز کردہ است ۔
از جہت این فقیر اورا در تدریس این علم مجاز است ۔خدای تعالیٰ
اورا نافع مسلمانان گرداند در دین ایشان و در دنیا ایشان آمین ۔"

مولانا مظفر کی تحریر مندرجہ بالا سے یہ بات مشہود ہوتی ہے کہ نوشہ توحید مکہ معظمہ میں چار سال تک اقامت گزیں رہے ۔اور اس عرصے میں انھوں نے قرآن کا فن وہاں معروف روزگار معلموں سے سیکھا اور علم حدیث کے دروس کی تکمیل اپنے عم محترم کے حضور میں کی ۔مولانا مظفر نوشہ توحید کے ظاہر و باطن کی ستایش کرتے ہوئے ان کے حق میں دعا خیر کرتے ہیں ۔حضرت مخدوم احمد لنگر دریا نے اپنے ملفوظ مونس القلوب میں حضرت نوشہ توحید کے احوال وخصائل کو شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔جس سے ان کی شخصیت کے مختلف ابعاد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مخدوم احمد لنگر دریا نے ان کے شب وروز سے متعلق ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان کے فقر وفروتنی، فیاضی وجوادی، ایثار وفداکاری اور شرف نفس کا اندازہ ہوتا ہے۔مونس القلوب کے علاوہ مناقب الاصفیا ،اخبار الاخیار ،گنج لا تخفی اور کچھ دوسرے مآخذ میں بھی حضرت نوشہ توحید کے ظاہری ومعنوی کمالات کا ذکر ہوا ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا نوشہ توحید کی وجاہت ،جلال وجمال اور ظاہری مشخصات کے بیان میں کہتے ہیں کہ حضرت نوشہ توحید کی شخصیت اس درجہ بارعب وباوقار تھی کہ لوگ ان کے چہرے پر مستقیماً نظر ڈالنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ جب وہ سر جھکاتے یا ان کا رخ انور کسی اور طرف مائل ہوتا تب ہی ان کے جلوۂ رخسار کا دیدار ممکن ہوتا۔ وہ

ایک صاحب بصیرت عالم تھے اور ایک ریاضت کش زاہد بھی ۔ وہ ایک خداشناس صوفی تھے لیکن اطوار وآداب زندگی میں ہمیشہ سنت وشریعت کے احکام کی پیروی کرتے تھے۔ احمد لنگر دریا کے قول کے مطابق ان کی خانقاہ میں ہمیشہ تیں چالیس فقرا وصوفیا اوراد و اذکار میں ہمہ وقت مشغول رہتے تھے۔ حضرت نوشہ توحید کی تصنیفات رفیع و وقیع مشتملات کی بنا پر بیرون ہند بھی اعتبار واحترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ مونس القلوب کے مرتب نے لکھا ہے کہ ایک بار میں کاشف اسرار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس اثنا میں حضرت احمد لنگر دریا نے ذکر فرمایا کہ عدن میں شیخ سعد نام کے ایک بزرگ تھے جنھوں نے نوشہ توحید کی تصنیف 'حضرات خمس' کی ستایش کی تھی اور انھوں نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان میں ایسا دانشور موجود ہے جس نے ایسی بیش قیمت اور بلند مرتبت تصنیف کو معرض تحریر میں لایا ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا نے جیسا ذکر کیا ہے، حضرت نوشہ توحید زہد وریاضت اور اپنے نفس کے خلاف جہد کرنے میں ہمت وحوصلہ کے بزرگ تھے۔ حضرت احمد نے ان کے اٹھارہویں فاقہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت نوشہ توحید کسی کو مرید کرنے سے پہلے اس کا امتحان بھی لیتے تھے اور جود وسخا میں وہ کم نظیر تھے۔ کبھی کوئی سائل ان کے گھر سے مایوس نہیں لوٹتا تھا اور بلا تفریق عقاید وادیان وہ انسانوں کی مدد کرتے تھے۔ سلسلۂ فردوسیہ کے دوسرے صوفیا کے مانند وہ عمل کے لیے علم کو لازم جانتے تھے۔ وہ خود بھی صاحب علم صوفی تھے اور اپنے عقیدت مندوں کو حصول علم کے لیے تشویق کرتے تھے۔

حضرت نوشہ توحید نے دو نکاح کیے تھے۔ اول عقد نکاح کے نتیجے میں دو فرزند متولد ہوئے شاہ سلیمان اور شاہ سیف الدین۔ عقد ثانی حضرت نے اپنی عم زاد بہن بی بی عروسہ بنت شیخ قمر الدین سے کیا جن سے حضرت جشن دائم عرصۂ وجود میں آئے۔ حضرت نوشہ توحید کے سفر آخرت کا وقت آیا تو ان کے فرزند شیخ حسن دائم نے ان سے اظہار مدعا کیا کہ ان کی جملہ ضرورتوں کی کفالت وہ اپنی حیات میں کرتے رہے لیکن اب

جب کہ وہ قریب مرگ ہو چکے ہیں اور دنیا کو الوداع کہنے والے ہیں، میں اپنے احتیاجات کے ایفا کے لیے کس سے رجوع کروں گا۔ حضرت نوشہ توحید نے جواب دیا کہ جو شخص دنیا میں بقید حیات رہ کر دخل وتصرف کی لیاقت رکھ سکتا ہے وہ بند کالبد سے آزاد ہو کر اس امر کو کئی گنا بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی وارستہ روح چشم زدن میں عندالللزوم کہیں بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے فرزند کو یقین و اطمینان دلایا کہ وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے ان کی طرف توجہ کرے اور مخدوم جہاں سے عرض کرے۔

سلسلۂ فردوسیہ کے اس والا مرتبت عارف کی وفات ۲۴؍ ذی الحجہ ۸۴۴ھ کو سہ شنبہ کے روز بہار شریف میں ہوئی۔

حضرت نوشہ توحید کے ادبی آثار عربی وفارسی دونوں زبانوں میں دستیاب ہیں۔ انھوں نے اخلاقی عرفانی اور شرعی موضوعات پر گرانقدر مختصر رسالے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی جملہ تصنیفات میں ان کا مجموعۂ مکتوبات اور دیوان اشعار فارسی بیشتر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی مثنوی بعنوان ''افتخار حسینی'' بھی اپنے معانی ومطالب کے اعتبار سے درخور توجہ ہے۔ ان کے ادبی آثار میں ایک ملفوظ بعنوان گنج لا تخفی بھی ہے۔ نوشہ توحید کے مجموعۂ مکتوبات کے مرتب ان کے فرزند جشن دائم تھے۔ اپنے دونوں بزرگوں کی حضرت مخدوم شرف الدین احمد اور مولانا مظفر بلخی کی طرح نوشہ توحید نے بھی اسرار و نکات تصوف اور موارد شریعت وطریقت سے مشحون مکاتیب قلم بند کیے ہیں۔ یہ گرانمایہ مکاتیب پند وموعظت، آیات واحادیث اور اخبار کی توضیح وتفسیر، مسائل شرعیہ اور سلوک وتصوف کے مطالب وموضوعات پر محتوی ہیں۔ مکتوبات کی تعداد ۱۵۴ ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں نوشہ توحید کے مکتوبات کو شایستہ توجہ تصور کیا ہے اور ان کے کچھ خطوط کو اپنے تذکرے میں شامل بھی کیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب طالبان حق کے لیے عرفان وآ گہی کا ایک معتبر منبع ہے۔

نوشہ توحید کے ملفوظ گنج لایخفیٰ کی تصنیف نزاع واختلاف کا موضوع رہی ہے۔
مولانا عبدالرؤف اورنگ آبادی اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا ملفوظ گنج لایخفیٰ، کو مخدوم الملک سے منسوب کرتے ہیں اور حسین معز بلخی کو اس کا کاتب تصور کرتے ہیں۔ اسی کی تقلید کرتے ہوئے محمد معین الدین دردائی اپنی کتاب ''تاریخ سلسلۂ فردوسیہ'' میں اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں:

''گنج لایخفیٰ مخدوم الملک کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کے جامع حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی فردوسی ہیں۔ ۱۸۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ زیر نظر قلمی نسخہ کے کاتب محمد یعقوب بلخی ہیں اور سنہ کتابت ۱۲۲۱ھ ہے۔ جہاں پر کاتب نے کتاب ختم کی ہے وہاں اپنی غلط فہمی کی بنا پر یہ جملہ لکھ دیا ہے ''گنج لایخفیٰ من کلام حضرت ملک المشائخ مولانا حسین معز شمس بلخی قدس سرہ''۔ حالانکہ حضرت حسین معز شمس بلخی اس کے صرف جامع ہیں۔ مخدوم الملک کی جن مجالس میں حضرت نوشہ توحید کی حاضری اور شرکت ہوتی تھی اور ان میں اپنے مرشد مخدوم الملک کی زبان فیض ترجمان سے جو حقائق ومعارف انھوں نے سنے ان کو ۷۵ مجالس میں تقسیم کر کے اپنے مرشد ہی کی زندگی میں مرتب کر لیا تھا اور اس کا نام گنج لایخفیٰ رکھ دیا تھا، دیگر ملفوظات مخدوم الملک کی طرح یہ بھی اسرار و رموز کا سرچشمہ ہے۔''

مولانا عبدالرؤف کے مذکورہ مقالہ کے مطابق جو رسالہ معارف ۱۹۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا ملفوظ گنج لایخفیٰ، مخدوم الملک کی زندگی میں ہی ترتیب و تنظیم کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ لیکن گنج لایخفیٰ کی آخری مجلس میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ ملفوظ ۸۴۴ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا جب کہ مخدوم الملک حضرت شرف الدین کا وصال ۷۸۲ھ میں ہو چکا تھا۔ پروفیسر دردائی نے بھی مولانا عبدالرؤف کے خیال کی تائید کی

ہے کہ یہ ملفوظ حضرت مخدوم الملک کی حیات ہی میں مرتب کیا جاچکا تھا۔ پس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حضرات نے ملفوظ کے مشتملات کا مطالعہ کیے بغیر ایسی گمراہ کن رائے قائم کی۔ پروفیسر شاکر یحییٰ خلیق، سابق صدر شعبۂ اردو میتھلا یونیورسٹی بہار نے اپنے تحقیقی مقالے میں جواب ''حضرت نوشہ توحید حیات وخدمات'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوچکا ہے متعدد بیرونی واندرونی شواہد کے وسیلے سے اس امر کو پایۂ تحقیق تک پہنچادیا ہے کہ گنج لایخفی حتماً حضرت نوشہ توحید کا ملفوظ ہے۔ پروفیسر موصوف کا یہ مقالہ جوان کے صبر آزما تلاش وتجسس اور صعوبت ومشقت کا ثمرہ ہے، شایستۂ تحسین وستایش ہے۔

مرحوم پروفیسر سید حسن نے بھی اپنی کتاب ''مجموعہ اشعار مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی''، میں گنج لایخفی کو حضرت نوشہ توحید کا ملفوظ بتایا ہے۔

حضرت نوشہ توحید کے ترشحات ذہن وضمیر کا یہ نتیجہ بھی ان کے مجموعہ مکتوبات کی طرح معارف وحکیم کا گنجینہ ہے۔ جو سالکان جادۂ حق کی رہنمائی کے لیے نہایت ارزشمند وسیلہ ہے۔ حضرت نوشہ توحید کے شعری تخلیقات میں دیوان غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی بعنوان ''افتخار حسینی'' بھی ہے۔ نوشہ توحید نے اس مثنوی میں مولانا جلال الدین رومی کی پیروی کی ہے۔ مثنوی معنوی کی بحر اور طرز بیان کی تقلید میں منظوم کی گئی یہ مثنوی نوشہ توحید کا ایک قابل قدر شعری کارنامہ ہے۔ اس مثنوی میں جو چہار درویش کے قصے بیان ہوئے ہیں اس لیے یہ منظومہ مثنوی 'چہار درویش' کے نام سے بھی موسوم ہے۔

مثنوی معروف صوفی شعرا کی پسندیدہ صنف رہی ہے۔ سنائی، عطّار، رومی، نظامی، جامی، عراقی اور محمود شبستری جیسے حق کی جستجو اور وصل خدائے متعال کی آرزو میں دایماً منہمک ومشغول رہنے والے صوفی شاعروں نے اسرار ونکات تصوف کی توضیحات کے لیے مثنوی کو وسیلہ بنایا۔ یہ صوفی شعراء مطالبِ عرفان وتصوف کو تمثیلات وحکایات، اسمار وقصص کے ذریعہ ذہن نشین کراتے تھے جن کو شعری شکل میں لانے کے لیے مثنوی کا قالب نہایت موزوں ومناسب ہے۔ اس کی ہیئت میں واقعہ کی تفصیلات کے شرح و

بیان کے لیے گنجائش ہوتی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی کو نمونہ وسرمشق قرار دے کر یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار بقرار ذیل ہیں:

بشنو از نی این حکایت را بدل تارود آلایشت از آب و گل
شد جدائی از نیستانم و بال باز می خواهم به اصل خود وصال
من بهر کس چون صبا آمیختم همچو شبنم خون دل را ریختم

حضرت نوشہ توحید نے موقعہ ومحل کی مناسبت سے اس مثنوی میں مثنوی رومی کے اشعار کو بھی شامل کرنے سے احتراز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے مثنوی کے آغاز میں اپنے پیر جواُن کے معلم بھی تھے کا ذکر بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار اس امر سے متعلق اس طرح ہیں:

بود مارا اوستادی دلپذیر خضر وقت خود بشیر و بی نظیر
کی توان گفتن زحال او نشان هر نفس می داد ما را نور جان
جان او پیوست دائم با احد وصف اورا قل هو الله الصمد
واجب آمد چون که آمد نام او شرح رمزی کردن از انعام او
سالها بودم چون موسیٰ باخضر نور شمس افتاد بر روی قمر
شمس چه بود شمس را ابرو کجا آیت واللیل آن گیسو کجا

ان اشعار کا اشارہ حضرت مظفر شمس بلخی کی جانب ہے جو حضرت نوشہ توحید کے پیر و مرشد تھے۔ حضرت مخدوم الملک کی منقبت میں بھی اس مثنوی میں اشعار ہیں۔ چند اشعار مثالاً درج کیے جاتے ہیں:

بود شرف الدین یحییٰ جان من جان چه باشد جان جان جان من
بعد زانم وصف گفتن گشت شاق تو که آمد یاد مارا الفراق
چون شده خورشید جانم زیر میغ ای دریغا ای دریغا ای دریغ
شد ز هجرت هفتصد و هشتاد وپنج بود زیر خاک پنهاں گشت گنج

رومی کی مثنوی کی طرح یہ مثنوی بھی چھ دفتروں پر محتوی ہے۔اس مثنوی میں اشعار کی تعداد چار ہزار دوسو ترپن ہے۔ یہ مثنوی رومی کی مثنوی کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی نگار خود درج ذیل شعر میں اس امر کا اقرار کرتے ہیں:

مقصد من پیرویٔ مولوی　　برطراز او بگویم مثنوی

اس مثنوی میں قصوں کے پیرائے میں صدق وصفا، ایمان وایقان، اخلاص و اخلاق سے متعلق عبرت آموز باتیں بتائی گئیں ہیں۔تصوف کے مسائل و نکات کو تمثیلات کے لباس میں بیان کیا گیا ہے۔فکروفن کے معیار ومقیاس کے اعتبار سے یہ منظومہ ایک مستحسن تقلیدی کوشش ہے۔

دیوان نوشہ توحید کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غزل سرا کی حیثیت سے وہ سلسلۂ فردوسیہ کے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ دلآویز واثرانگیز ہیں۔ان کے شعروں میں صورت ومعنی کا معقول امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنے رفیع ووقیع متصوفانہ افکار کو شعری کیفیت میں ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ان کے شعروں کو پڑھنے سے بہ اعتبار مجموعی انزجار وبے لطفی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ان کا قریحۂ شعری لائق تحسین ہے۔ وہ تصوف کے یبوست خیز مطالب کو اپنے شعری ہنر سے لطف انگیز بنادیتے تھے۔ ذیل میں ان کے شعری مزاج و مذاق کو بخو احسن سمجھنے کے لیے ان کی چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں:

ای صفای چہرۂ تو داد صوفی را صفا　　سجدہ گاہِ ابرویت محراب اہل اصطفا
زلف وعارض چون ید بیضا و مار موسوی　　خال وخطش چون بلال ہمنشین مصطفیٰ
گہ دو لعلش بادہ گردد گہ خورد خون جگر　　گہ دو چشمش دل نواز د گہ کند جور و جفا
یار زیبا گر زند خنجر بفرقم دم مکش　　کاندرین رہ شرط کار دوستی باشد وفا
گرحسین از تیغ ھجران کشتہ گردد باک نیست　　ہر حسینی عاقبت دارد یزیدی در قفا

....

از عرش برتر است نظرگاہِ جان ما — نی نی ورای عقل کل آمد جہان ما
ما در جناب حضرت مولا یگانہ ایم — آری دوئی روا نبود درمیان ما
سیمرغ وار گوشہ وحدت گزیدہ ایم — بیرون زہر دو کون طلب آشیان ما
نگہ کن یکدمی بیچارگان را — تفحص کن زمانی کشتگان را
نفیر از دست ہندوی غم تو — برآمد ہر طرف وا ماندگان را
چو قبلہ طاق ابروی بتان شد — سجود آورد جان مہ پارگان را
بخاک آستانت جبہہ سودن — سروسامان بود آوارگان را
ندای کشتن عشاق برخاست — بشارت دہ حسین افتادگان را

....

گرمن از رخ برگشایم پردۂ تلبیس را — درنظر فرقی نماند آدم و ابلیس را
گرملک را وانمایم روئی خود از تیرہ خاک — روح قدسی ترک آرد سجدۂ تقدیس را
خضر با علم لدن بر جہل خود گردد مقر — از کتاب خود اگر دعوا کنم تدریس را
گرز تار عشق بیرون آورم یک شعلہ ای — دوزخِ نمرود سازم جنت ادریس را
آدم وابلیس آرد سجدہ پیشت ای حسین — گرمن از رخ برگشایم پردۂ تلبیس را

....

شہی کہ ملک دو عالم جمال حضرت اوست — قبای کون و مکانش کمینہ کسوت اوست
ظہور نور تجلی کہ برجبین بتانست — ہمہ لطافت وخوبی ہمہ ملاحت اوست
جمالِ منظر نیکو ہرآنچہ در نظر است — چو نیک نیک ببینی کمال طلعت اوست
اگرچہ صورت اشیا تعدد است ولیک — ہمہ حقیقت اشیا شمول وحدت اوست
نہ انتظار بقایش کند حسین گہی — کہ درمقابل چشمش ہمیشہ صورت اوست

....

ترسا بچۂ نگار سرمست — از ناوک غمزہ جان ماخست

از حلقہ ٔ زلف کردہ زنار | بربست میان و حلقہ بربست
ببرید دلم زدین و ملت | با مذہب عشق وی بپیوست
ہر صاحب خرقہ کہ دیدش | زنار بروی خرقہ بربست
این طرفہ نگر کہ چشم مستش | بی تیرو کمان و قبضہ و شست
دنبال حسینؔ کرد عمداً | تا قلب خرد بقہر بشکست
در حلقۂ جعد وی دلی را | نی پاس خلاص ماندنی دست

....

ہرکس بدین خویش گرفتند قبلہ ای | شدروی دوست قبلۂ جان وروان ما
شبہات عقل وعلم کہ حسی و درسی اند | عقل کل است وعلم لدنی ازان ما

....

مارا نظر بروی تو فردوس اکبراست | فردوس بی جمال تو نزلی محقر است
پا بر سریر ملک دو عالم کجا نہد | کیخسروی کہ تاج خدائیش برسراست
موسی وشم ز شاخ درخت وجود خود | درگوش جان ندای اناالحق مقرراست
مطرب بیا و نغمۂ عشاق را نواز | ساقی بیار بادہ کہ محبوب دربراست
از جزو کل ہر آنچہ تصور کند خیال | ہر ذرہ ای ز نور حقیقت مصور است

....

حضرت نوشہ توحید کی دیگر تصنیفات میں 'حضرات خمس، رسالہ 'قضا وقدر، رسالۂ توحید خاص، رسالۂ توحید اخص الخواص، رسالہ ذکر وجود اول وبدایت آن وبیان معرفت عالم ونہایت آن اوراورادِہ فصلی وغیرہ ہیں۔

'حضراتِ خمس عربی زبان میں لکھا ہوا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں تجلیات خداوند متعال کی پانچ صورتیں متعین کی گئی ہیں اور نہایت محققانہ انداز میں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کتاب کے نکات وغوامض عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہے۔

اس کتاب کو عرب کے علما نے بھی لائق مطالعہ تصور کیا ہے۔ حضرت نوشہ توحید کے فرزند مولانا شیخ حسین دائم نے اس کی شرح لکھی ہے جو کاشف الاسرار کے نام سے موسوم ہے۔ رسالہ قضا وقدر، میں تقدیر کے رموز واسرار اور خیر وشر کے مسائل کو پانچ فصلوں میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور قضا وقدر کے امور کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کے نتیجے میں قدریہ، جبریہ اور شنویہ جیسے فرقے ظہور میں آئے ان کے خیالات کو مدلل طور پر رد کیا گیا ہے۔

رسالہ' توحید خاص' ایک مختصر رسالہ ہے جس میں وحدت الوجود کے معانی و مفاہیم کو نہایت دلپذیر دلیلوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

'توحید اخص الخواص' آٹھ صفحات پر مشتمل ایک مفید و معنی خیز رسالہ ہے جس کے وسیلہ سے وحدت الوجود کے مسائل کو چھ محکم دلیلوں سے باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

وجود عالم و بدایت و نہایت عالم، معرفت عالم کے موضوع پر ایک گرانقدر رسالہ ہے۔ دنیا کے آغاز وانجام کے ادراک کے لیے یہ رسالہ نہایت مفید ہے۔

رسالہ' اورادِ دہ فصلی' اوراد و وظائف کا ایک معتبر مجموعہ ہے۔ یہ غیر مطبوعہ رسالہ ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

ذیل میں نوشہ توحید کے چند مکتوبات نمونتہً نقل کیے جاتے ہیں:

"مکتوب چہل و ہشتم در معنیٔ خودی و بیخودی

مولانا سماء الدین، سلام و دعاء از حسین معز مطالعہ کند و بدانکہ محبوب از محبّ خود دوری نیست و ہو معکم مویدٔ این معنی است، اما محبّ را از محبوب دوری است چہ او بخود محجوب است خود را و محبوب را در یک لوح وجودی خواند و ہر کرا در روی نظر است او از عالم محبوب بی خبر است مثنوی ؎

تا تو با خویشی عدد بینی ہمہ   چون شوی فانی احد بینی ہمہ

باخود آنرا در سراپردۂ وحدانیت، اما دانم تو ہنوز خودی و بیخودی

ندانی، میخواستم چیزی نویسم ......خودی عبارت است از جملہ حرکات وسکنات از خوردن و پوشیدن و گفتن وشنودن وخفتن و بر خطوط پرداختن مگر آنچہ ازاین جملہ بہ ضرورت افتد وضرورت این طائفہ آن است کہ اگر آن نکند ازحق دور افتد، آنکہ برین حد ضرورت قدم میزند گویند در راہ بیخودی می زند۔ ای دوست ضرورت درشمار نیست ۔ اگر زبان جز ازضرورت وکلام پاک شد آنرا صامت خوانند وابکم گویند وچون گوش از غیرضرورت پاک شد اصم گویند وچون چشم از غیرضرورت پاک شد اعمیٰ گویند وچون لقمہ از غیرضرورت پاک شد جائع گویند و چون لباس از غیر ضرورت پاک شد عاری خوانند۔ القصہ سخن گوئی و طعام خوری و جامہ پوشی ومعہ ذالک سوگند توانی خورد کہ نمی گویم ونمی گویم نمی خورم و نمی پوشم آنگاہ گویندت کہ قدم درراہ بیخودی اثبات یافتہ است۔

مکتوب پنجاہ وسوم درحذر از صحبت اہل ہوا وذکر محبت:

مقرری فرزندی باد- چون ہرچہ ہست برای طلب خدای راست، این زمان خودرا گردآری و وظیفۂ لیل ونہار فوت نکند واز تاثیر صحبتی کہ درآن دروغ وفحش ولایعنی و بھنگ وشراب حاصل شود پرہیز واجب وفریفتہ گیرد وخبر لابدنگوید واوراد ونماز راملازمت نماید اصلا فوت نکند واین بنیاد رامحکم بدارد وآنکہ سبب شہوت نبشتہ بود داروی شہوت ہمین گرسنگی است وترک لذات است ۔اگرشکم پرکند آنگاہ نفس طربا با وخواہد بردوہوش دارد وآنکہ درباب معیت نبشتہ بود ہم چنان است، خدای باہمہ است، چو باہمہ باشد ہمہ چیز را حرمت باید داشت و باہمہ دوستی قائم باید

داشت و نیک خواہی ہمہ باید کرد و راستی ہمہ باید کرد و اگر کار افتد و اگر نہ درخلوت خود با خدای ہمچنیں نزدیک باید بود کہ ہم چنین نزدیک حاضر است ۔ وطلب او باید کرد بچہ بہ جوع شدید و عطش مفرط وسہر دائم و بہ فکر لازم یعنی بگرسنگی سخت و تشنگی بسیار و بیداریٔ شب دائم وفکر لازم واین فکر از نزدیک حق است و حاضری سلوک تمام گفتہ ام اگر مرد است بگیرد و بر اندازۂ ہمت بگیرد والسلام ۔''

اوّل الذکر مکتوب مولانا سماء الدین کے نام تحریر ہوا ہے ۔ حضرت نوشہ توحید یہاں پر مولانا موصوف کوخودی وبیخودی کے معانی سمجھا رہے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ محبوب ہر آن اپنے چاہنے والوں کی معیت میں ہوتا ہےلیکن عاشق کواپنے محبوب سے بسہولت قربت حاصل نہیں ہوتی ۔ دیدار محبوب میں نامرادی کا سبب اس کی خودی کا حجاب ہے ۔ جب تک وہ خودی ومنّیت کے خیلستان میں گردش کرتا رہے گا وہ تجلی ایزد باری سے بے بہرہ وبےنصیب رہے گا ۔اور جب تک اس کی نظر کثرت میں الجھی رہے گی اسے عالم محبوب کی کوئی خبرنہیں ملے گی جب تک وہ اپنی ہستی کے گمان وفریب میں مقید رہے گا۔ موجودات عالم کا تعدّد جستجوی احدیت میں مانع آئے گا۔ پھر خودی کے مفہوم کواس طرح واضح کرتے ہیں کہ ترک خودی کا مطلب یہ ہے کہ انسان بلاضرورت جملہ حرکات وسکنات ،افعال واعمال مثلاً کھانے ، پینے ، بولنے ، سننے اور سونے سے وہ اجتناب کرے اورضرورت کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ عمل نہ کیا جائے تو اس کی جان کوخطرہ لاحق ہوسکتا ہے یا حق العباد کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے ۔ پس ضروری ہے کہ وہ سخن گوئی ، طعام خوری اور جامہ پوشی عنداللزوم کرے ۔ یعنی اس کا ہر عمل خود کے لیےنہیں بلکہ خدا کے لیے ہونا چاہئے ۔اور سالک اپنے آپ کواس مرحلے پر پہنچاتا ہےتو گویا بیخودی کی سعادت اسے حاصل ہوگی ۔اور دوئی وکثرت کے انتشار سے وہ باہر نکل آیا ہےاور مقام احدیت سے وہ قریب تر ہو چکا ہے۔

ثانی الذکر مکتوب جو ''حذر از صحبت اہل ہوا و ذکر محبت'' کے تحت عنوان ہے فرزند کے نام لکھا گیا ہے۔ حضرت نوشہ توحید اس مکتوب میں اہل ہوس کی صحبت سے پرہیز کرنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اور مبحث محبت بھی اس مکتوب میں حضرت موصوف کے ذکر وفکر کے تحت رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جہان میں ہرشے کو خدا کی طلب ہے۔ اور یہی وقت ہے کہ تمھیں اپنی طبیعت کی عنان کو اپنے اختیار میں لینا چاہئے۔ اور شب وروز کے فرائض کو انجام دینے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ اور ایسی صحبتوں سے احتراز واجب ہے جہاں دروغ گوئی، بیہودگی، فحاشی، بھانگ اور شراب جیسی مخدّر و مخرّب اخلاق اشیاء سے وابستگی کا خطرہ ہو۔ اور شہوانی تمایلات کو برانگیختہ کرنے کی تمام چیزوں سے بچنا چاہئے اور شہوت کی دواگرسنگی اور ترک لذات ہے۔ شکم جب سیر ہوتا ہے تو نفس شہوانیت کی طرف راغب ہوتا ہے اور معیت کا مسئلہ یہ ہے کہ خداوند عالم جہان اور جملہ جہانیان کے ساتھ ہے۔ لہٰذا تمام اشیاء کا احترام ضروری ہے اور جملہ بندگان خدا سے مہر والفت اور تلطّف و مدارا کا رشتہ رکھنا چاہئے۔ اور خلوت میں خدا سے نزدیک ہونے کی کوشش کرو اس طرح کہ تمھیں یقین ہو کہ ذات حق حاضر و ناظر ہے۔ اور شدید بھوک، پیاس اور لاینقطع شب بیداری اور ذکر وفکر ایزد متعال میں مشغول رہنا چاہئے اور یہ مقام وصل وفنا تک پہنچنے کے لیے، سلوک کے مدارج طے کرنے سے متعلق ہیں۔ ہر شخص بقدر ہمت ان کو اختیار کرسکتا ہے۔

شیخ حسن دائم جشن فردوسی:

شیخ حسن دائم جشن فردوسی حضرت نوشہ توحید کے فرزند اور جانشین تھے۔ دینی اور دنیاوی تعلیمات کی تحصیل اپنے پدر محترم کے حضور میں کی۔ مونس القلوب، جوان کے فرزند حضرت احمد لنگر دریا کا گرانمایہ ملفوظ ہے کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسن دائم جشن کی طبیعت میں سخاوت وفیاضی بدرجہ اتم تھی۔ حضرت احمد لنگر دریا نے اپنے والد ماجد سے متعلق کئی واقعات مونس القلوب میں قلم بند کیے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ اس طرح مذکور

ہوا ہے کہ ایک مجلس میں حضرت حسن دائم سے کسی نے یہ سوال کیا کہ آخر اس بات میں کون سی مصلحت تھی کہ رسول کریمؐ نے اپنی وفات کے وقت مسواک کرنا پسند فرمایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں تمام عبادتوں کو گزار چکے تھے لیکن آخری وقت میں جب وہ اس جہان سے رحلت کرنے والے تھے تو اپنے سارے اعمال عبادت کو ناقص و ناکافی تصور کیا اور از سر نو عبادت کی شروعات کی۔ اور وضو چونکہ طاعت وعبادت کی ابتدا ہے اور مسواک وضو کی ابتدا ہے لہٰذا آخری لمحات زندگی میں مسواک کو ضروری سمجھا۔ ایک دوسرا واقعہ مونس القلوب میں اس طرح مرقوم ہوا ہے کہ حضرت حسن دائم جشن سے کسی نے پوچھا کہ خواجہ بایزید بسطامی شروع میں 'سبحانی ما اعظم شانی' کا ادعا کرتے تھے لیکن انتقال کے وقت انھوں نے اس قول سے توبہ کر لی تھی اور یہ کہا کہ آج میں اگر ایسا کہوں تو میں مومن نہیں بلکہ مجوسی ہوں گا اور اب کہتا ہوں کہ **اشھدُ ان لا الٰہ الا اللہ وَاَشھَدُ اَنَّ مُحمَّداً عبدُہٗ و رسُولہٗ**۔ تو ایسی صورت اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حضرت حسن دائم نے جواب دیا کہ یہ انحطاط کی طرف مائل ہونے کی علامت نہیں ہے بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی جانب صعود کی صورت ہے۔ کیونکہ حضرت بایزید بسطامی پہلے سبحانی ما اعظم شانی کہتے تھے تو تقدس و پاکیزگی کو اپنی جانب منسوب کرتے تھے اور حق کا جلوہ اپنی ذات میں دیکھتے تھے لیکن اب توبہ کر کے توحید مقیّد سے توحید مطلق کی جانب آ گئے۔

آپ کی تصنیفات میں دو کتابیں شہرت رکھتی ہیں۔ اوّل کاشف الاسرار، جو حضرت نوشہ توحید کی عربی زبان میں تصنیف کردہ کتاب 'حضرات خمس' کی شرح ہے اور دوم 'لطائف المعانی'۔ دونوں کتابیں متصوفانہ موضوعات پر مشتمل ہیں جن میں رموز احدیت ایزد متعال اور دوسرے نکات ایمان وایقان کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ذیل میں ''کاشف الاسرار'' کے مشتملات سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس میں صوفی موحد اور قلندر کی بابت ایک بصیرت افروز تذکرہ ہے:

''بدان کہ اصطلاح صوفیان واہل وحدت یکی است و قلندر نیز قریب بہ صوفی است۔ بعضی محققان میان صوفی وقلندر فرقی گفتہ اند کہ صوفی آنست کہ ظاہر و باطن او آراستہ بہ شریعت و طریقت وحقیقت ومعرفت وواصل ذات بود واز صفات بہ کلی عبور کردہ وترقی نمودہ باشد ومتخلق بہ اخلاق اللہ گشتہ باشد واسقاط اضافات کردہ باشد واذا اتم الفقر فھو اللہ حال او گشتہ باشد۔ قطعہ:

ہرجا کہ برفتیم برای تو برفتیم   وآنجا کہ نشستیم برای تو نشستیم
جز یاد تو در خاطر خود بار ندادیم   جز نقش تو بر صفحۂ دل نقش نہ بستیم
صد شکر بکردند بہ پیش تو چو آدم   آن قوم کہ میگفت کہ مابت نہ پرستیم

وقلندر جز یک مہم ویک عمل وطلب دیگر نبود ومقصود جانش جز وصول بذات اللہ تعالیٰ واسقاط اضافات ورفع صفات در جمیع احوال دیگر نہ باشد چنانکہ گفت:

عاشق صادق چہ داند کعبہ وبتخانہ چیست   ہر کجا یابد نشان یار خود آنجا شود

وبعضی ہیچ فرقی نگفتہ اند۔ چنانچہ خواجہ فریدالدین عطار ومولانا روم وشیخ شرف الدین پانی پتی ومشائخ طبقات مارضوان اللہ علیہم، شیخ ما گفت:

جمال پر تو جان قلندر   زنور پاک حق گشتہ مصور
قلندر کی بیاید درعبادت   قلندر کی بگنجد در اشارت
قلندر نیست گشتہ در جدائی   نہ آنجا بندگی دان نی خدائی

صوفیانیم آمدہ در کوی تو   پیش چوگان گشتہ ہم چوں گوی تو

وصوفی وقلندر ودرویش وفقیر در اصطلاح ایشان یکی است۔''

خلاصہ یہ ہے کہ موحد وصوفی اصطلاحاً یکساں ہیں اور قلندر بھی عادات و خصائل میں صوفی سے بہت قریب ہے۔ لیکن بعض دانشوروں نے صوفی وقلندر کے مابین

فرق کے عناصر کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ایسے محققوں کی نظر میں صوفی وہ ہے جس کا ظاہر و باطن شریعت و طریقت سے آراستہ ہو، ذات سے متصل ہو اور صفات کے مراحل کو عبور کر چکا ہو اور مختصات اخلاق ایزدی اپنی طبیعت میں پیدا کر لیا ہو اور غیر لازم امور سے اپنے آپ کو جدا کر لیا ہو۔ اور قلندر فقط ایک شے کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی حیات کا مقصد وصل ذات حق کا حصول ہے۔ وہ طاعات و عبادات، اور احکام شریعت کی پابندی سے بے قید ہوتا ہے۔ وہ صفات و غیر ضروری امور سے اپنے آپ کو غیر متعلق نہیں کرتا ہے۔ لیکن بعض مشائخ مثلاً خواجہ فرید الدین عطار، مولانا روم اور شیخ شرف الدین پانی پتی قلندروں کو دیگر صوفیوں سے مختلف نہیں سمجھتے ہیں۔ کاشف الاسرار کے ایک دوسرے ذکر میں آدمی کے سات اعضاء کو سات دروازوں سے مشابہت دی ہے اور اس طرح تنبیہ کی ہے کہ جو لوگ ان اعضاء کو اپنے اختیار میں نہیں رکھتے ان کے لیے یہ اعضاء دوزخ کے سات دروازے ثابت ہوں گے اور وہ لوگ جو ان اعضاء کو اپنے قابو میں رکھیں گے ان کے لیے یہ جنت کے سات دروازے ثابت ہوں گے۔ اس اقتباس کے کچھ جملے بقرار ذیل ہیں:

> ''حق تعالیٰ می فرماید وانّ جہنم لموعدہم اجمعین لہا سبعۃ ابواب لکل باب منہم جزء مقسوم۔ وآن ہفت عضوات کہ در آدمی موجود است کہ او نسخۂ عالم کبیر است۔ یکی چشم دوم زبان سوم گوش چہارم فرج، پنجم شکم، ششم جوارح، ہفتم نفس کہ صنم اکبر است و ہاویہ عظیم است۔ ہر کہ این ہفت ابواب را بہ مناہی و نامرضی و نامشروع مفتوح دارد و از آن اجتناب نہ نماید و احتساب نکند و از راہ آن استیفای لذات و شہوات کند این ہفت ابواب دوزخ او گردد و ہر کہ تزکیہ و اجتناب کند و از استیفای لذات و شہوات اجتناب نماید و این ابواب را از مناہی مسدود گرداند ہر ہفت مر او را بہشت گردد۔

ظاہر و باطن چو شد تسلیم دوست ما کنون حقا مسلمان می رویم''

مسئلہ طریقت کو تحت مطالعہ قرار دیتے ہوئے شیخ حسن دائم جشن بلخی نے کاشف الاسرار (شرح حضرات خمس) میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

''طریقت راہی است رفتنی، تصفیۂ باطن وتزکیۂ دل از صفات مذمومات بدو تعلق دارد، چنانچہ حقد وحسد وبغض وعداوت وایذا وکذب وفسق وغیبت وتکبر وحب مال وجاہ وحب زن وفرزند وجز آن۔

سعدی حجاب نیست تو آئینہ صاف دار زنگار خوردہ کی بنماید جمال دوست

ع: 'رواز خدا بہر چہ کنی شرک خالص است'۔ وحقیقت راہی است رفتنی کہ تزکیہ روح وتصفیۂ جان از لوث خطرۂ ماسویٰ اللہ واندیشۂ اغیار بدو تعلق دارد:

از دل برون کنم غم دنیا و آخرت یا خانہ جای رخت بود یا خیال دوست

دراین مقام سالک رادربانی دل وپاسبانئ جان فرض حال است، از شیخ ماست:

پاسبان دل شو اندر کل حال تا نیابد ہیچ درد آنجا مجال

ہر خیال غیر حق را دزد خوان این ریاضت سالکان را فرض دان''

یعنی طریقت صدق وصفا کا راستہ ہے۔ جس پر گامزن ہونے کے لیے سالک کے لیے لازم ہے کہ وہ زشت ومذموم صفات وتکدّرات سے اپنے باطن کو منزہ ومصفا بنالے اور ناپسندیدہ وغیر اخلاقی خیالات سے مثلاً حقد وحسد وغضب، بغض وعداوت، ایذا، کذب وغیبت، حب جاہ ومال، زن وفرزند سے یکسر غیر متعلق ہوجائے۔ اور حقیقت صاحب دلوں کا وہ جادہ ہے جس کو اختیار کرنے کے لیے انھیں ماسویٰ اللہ کے وساوس کی آلودگی سے اپنے ضمیر کو محفوظ ومامون رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں سالک اپنے دل کی لاینقطع مواظبت کرتا ہے۔ حضرت شیخ حسن دائم جشن کا وصال ۲۱ شعبان ۸۵۵ھ میں ہوا۔

شیخ حسن دائم جشن کی طبیعت میں عاجزی وفروتنی بہت زیادہ تھی۔آپ کے فرزند احمد لنگر دریا مونس القلوب میں ذکر فرماتے ہیں کہ کچھ دنوں کے لیے حضرت دائم جشن جونوشہ توحید کے خلیفہ تھے بیعت لینے کی روایت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ایک شب انھوں نے اپنے والد محترم شیخ حسین نوشہ توحید کو خواب میں دیکھا۔انھوں نے حضرت دائم جشن سے بیعت لینے کے عمل کو ترک کر دینے کا سبب دریافت کیا۔حضرت دائم جشن نے عالم خواب میں جواب دیا کہ وہ خود اپنے گناہوں کے بوجھ تلے نہایت خائف ہیں وہ دوسروں کو راہ راست دکھانے کا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔حضرت شیخ حسین فردوسیہ سلسلے کا ایک شجرہ ان کے حوالے کر کے فرمایا کہ خانوادۂ فردوسیہ کے چوبیس مشائخ کے ساتھ ان کا نام اس میں شامل ہے یا نہیں۔اور پھر انھیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کو کہا جہاں حضرت مظفر بلخی موجود تھے اور ان کے پیچھے مخدوم الملک اور ان کے پیچھے حضرت نجیب الدین فردوسی اور اسی طرح اس سلسلے کے دوسرے مشائخ بھی موجود تھے۔حضرت نوشہ توحید نے اپنے فرزند کو کہا کہ جس کی پیٹھ پر ایسے بزرگان ہوں اسے خائف نہیں ہونا چاہئے۔رویائے صادقہ کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا اور دوسری صبح حضرت دائم جشن نے بیعت لینے کا کام شروع کر دیا۔

حضرت احمد لنگر دریا بلخی:

حضرت احمد لنگر دریا حضرت حسن دائم جشن بلخی کے فرزند اور حضرت نوشہ توحید کے پوتے تھے۔ان کا تولد ۲۷؍رمضان المبارک ۸۲۶ھ میں ہوا تھا۔ان کی آموزش و پرورش ان کے جد امجد حضرت نوشہ توحید کے سایۂ میمنت میں ہوئی۔سن تمیز کو پہنچنے کے بعد احمد لنگر دریا نے حضرت نوشہ توحید کی رہنمائی اور مواظبت کے تحت متداول کتابوں کے درس کی تکمیل کی اور بیماری کی حالت میں حضرت نے انھیں عقاید نسفی معہ شرح مظفری ختم کرائی۔مکہ کے بحری سفر میں ایک بار ان کا جہاز معرض خطر میں پڑ گیا تھا۔جہاز غرق ہو جانے کے قریب تھا۔سارے زائرین اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔دوروز

تک جملہ مسافرین رنج و بلا میں مبتلا رہے۔ حضرت احمد لنگر دریا کے اہل و عیال بھی ان کے ہمراہ جہاز میں موجود تھے۔ اسی اثنا میں ان کی بیٹی فاطمہ کو نیند آ گئی۔ انھوں نے حضرت علیؓ کو خواب میں دیکھا جو تسلی دے رہے تھے کہ یہ جہاز ورطۂ بلا سے باہر نکل آئے گا اور سب لوگ اس مصیبت سے نجات پائیں گے۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔ جہاز مہلکہ سے نکل کر بحفاظت اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ یہ واقعہ مونس القلوب میں مذکور ہوا ہے۔ ذریعہ دولت اور دوسرے کئی ماخذوں نے اس ماجرا کو حضرت احمد کو لنگر دریا سے ملقب ہونے کا سبب بتایا ہے۔ حضرت احمد لنگر دریا کے احوال مناقب الاصفیا تالیف شیخ شعیب شیخپوری، اخبار الاخیار مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی اور وسیلۂ شرف تصنیف فرزند علی صوفی منیری اور چند دوسرے منابع میں موجود ہیں۔

حضرت احمد لنگر دریا کو فقہ و حدیث میں تبحر حاصل تھا اور عربی و فارسی زبان وادبیات پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ فارسی ادب کے ایک معتبر صاحب دیوان شاعر تھے۔

احمد لنگر دریا سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر دلوں کو برانگیختہ کرنے والے اشعار کی سماعت سے ان پر وجد و حال مستولی ہو جاتا تھا۔ کبھی وجد آفرین اشعار سن کر اس درجہ بے قرار ہو جاتے تھے کہ ان پر غشی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن سماع کی مجلسوں میں وہ عام لوگوں کے لیے پائے کوبی اور دست افشانی کو نا روا سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے نظریہ کا اظہار درج ذیل شعر میں ہوتا ہے:

رقص وقتی مسلّمت باشد کآستین برد و عالم افشانی

انھیں فن موسیقی سے رغبت تھی اور اسکی مختلف دھنوں سے وہ بخوبی واقف تھے اور کچھ سازوں کو بجانا بھی جانتے تھے۔

حضرت احمد لنگر دریا بہار میں خانوادۂ فردوسیہ کے مسند سجادگی پر تشریف فرما ہونے والے چوتھے بزرگ تھے۔ اپنے پدر محترم شیخ حسن دائم جشن کی وفات کے بعد خانقاہ فردوسیہ بہار شریف میں صاحب سجادہ منصوب ہوئے۔ انھوں نے تمایلات

شہوانی، خواہشات نفسانی، کبر وغرور اور مکر وریا کاری سے اجتناب کرنے کی تعلیم دی۔ ذریعۂ دولت کے مصنف نے حضرت احمد لنگر دریا کے عقاید وتعلیمات کے کچھ امور کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً حضرت احمد لنگر دریا کا یہ نظریہ تھا کہ اس جہان کی ہر شے خداوند عالم کی طالب ہے۔ ہر چیز خدا کی تسبیح خوانی میں مشغول ہے لیکن انسان وحوش وطیور، شجر وحجر، شمس وقمر، سیارگان وثوابت کے شیوہ ہای تسبیح خوانی کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ حضرت احمد لنگر دریا کو مخدوم جہان سے اس قدر محبت تھی کہ وہ کہتے تھے کہ اگر چہ پانچ باتوں کے لیے مسلمانوں کو خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہے- اول یہ کہ خدا نے انسان کو وجود میں لایا، دوم یہ کہ حیوان بنایا جماد نہیں بنایا، سوم یہ کہ حیوان مطلق نہیں بنایا بلکہ انسان بنایا، چہارم یہ کہ دین اسلام کی برکت سے مستفیض کیا، پنجم یہ کہ رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنایا۔ لیکن مجھ پر ایک شکر اور واجب ہے وہ یہ کہ مجھے حضرت شیخ شرف الدین احمد کے حلقۂ غلامان میں ہونے کا شرف عطا کیا۔

حضرت احمد لنگر دریا کے ادبی آثار میں ان کے ملفوظات کا مجموعہ موسوم بہ مونس القلوب، شریعت وطریقت سے متعلق نکات ودقائق کی اطلاعات کی حصول یابی کے لیے ایک بیش قیمت ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی اس کتاب مستطاب میں ادبی ثقافتی اور تاریخی موارد کے بھی نشانات ملتے ہیں۔ ''مونس القلوب'' کے دو خطی نسخے دستیاب ہیں۔ ایک نسخہ مرحوم شاہ تقی حسن بلخی کی خانقاہ 'فتوحہ' کی ملک ہے۔ یہ نسخہ پانچ سو پندرہ صفحات پر محتوی ہے جس کے صفحۂ آخر پر کاتب کا ترقیمہ شرح ذیل ہے:

> ''ھٰذ الکتاب بعون الملک الرب مسمی 'مونس القلوب'
> از زبان وملفوظ مخدوم قدوۃ العارفین، برہان العاشقین مفخر بنی آدم
> من خلفای ابراہیم ادہم حضرت شیخ احمد بن شیخ حسن بن شیخ حسین
> المعروف بہ نوشہ توحید بن شاہ معز شمس بلخی برادرِ شاہ مظفر قدس اللہ
> سرہما العزیز بتاریخ دوم شہر محرم الحرام ۱۲۴۱ھ فصلی روز دوشنبہ بوقت

عصر بمقام عدل پور پرگنہ سریسا بموجب ارشاد حضرت شاہ مخدوم بخش صاحب قبلۂ عالمیان رئیس الزمان، بخط ناقص عاصی الٰہی بخش انصاری متوطن قدیم موضع رائے پور پرگنہ غیاث پور یکی از معتقدان قدیم از...... آمدہ دہم ماہ شوال آغاز نوشتن کردہ بودم، بعرصۂ دو ماہ بست و دوم یوم باتمام رسید۔''

نسخۂ ہذا مملوکہ مرحوم شاہ تقی حسن بلخی سو مجلسوں پر مشتمل ہے۔ جب کہ خانقاہ منیر شریف کے نسخے میں مجلسوں کی تعداد ۹۸ ہے۔ نسخۂ خانقاہ فتوحہ کی کتابت منیر شریف کے نسخے سے قدیم تر ہے۔

مونس القلوب کی گرد آوری کرنے والے قاضی ابن خطاب منیری تھے جو احمد لنگر دریا کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ قاضی ابن خطاب کی یادداشت بہت مضبوط تھی۔ مجلسوں میں حضرت احمد لنگر دریا کے کلمات کو توجہ سے سماعت فرماتے، اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیتے تھے اور پھر ان کو معرض تحریر میں لاتے تھے۔ اس ملفوظ کے آغاز میں قاضی صاحب کا ایک مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے احمد لنگر دریا سے اپنی عقیدت مندی اور وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ اس مقدمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کتاب ھذا کا نام ''مونس القلوب'' انہیں کی تجویز کا نتیجہ ہے۔

اس ملفوظ میں حاضرین مجلس کے سوالات جو قرآن و حدیث، انبیاء، اولیا و مشائخ، مسائل و معاملات دین سے متعلق ہوتے تھے ان کے جواب دیئے گئے ہیں۔ آداب واصول دین، احکام شرع اور نکات عرفان وتصوف کی توضیحات بیان کی گئی ہے۔ مثلاً فقر و استغنا، تلاوت قرآن حکیم کی اہمیت و فضیلت، رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ، مخدوم شیخ شرف الدین احمد کی بہیا کے جنگل میں ریاضت کی زندگی، حضرت نوشہ توحید کی خانقاہ کے فقیروں کے احوال، فصوص الحکم کے مطالب، امراء القیس کی شاعری، مناقب مخدوم الملک، مناقب سلطان ابراہیم ادھم بلخی، مخلوق کو روزی پہنچانے کا مسئلہ، ملک عرب کی سیاحت، صوفیوں کے فقر و تجرّد کی زندگی، حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ، مولانا مظفر

شمس بلخی کے اشعار پر تبصرۂ معاصرین، انصار اور اصحاب صفہ کا بیان، امام احمد غزالی اور محمد غزالی کا تذکرہ، غزوۂ تبوک کا واقعہ، منصور حلاج کی بزرگی کا بیان۔ فیروز شاہ تغلق کی جانب سے ملی ہوئی جاگیر کو حضرت مخدوم الملک کا واپس کرنا، اور اسی طرح کے بہت سارے دینی ودنیوی مسائل ومعاملات، ثقافتی، ادبی اور تاریخی امور کو حضرت احمد لنگر دریا نے اپنے ملفوظات میں مذاکرہ وملاحظہ کا موضوع بنایا ہے۔

حضرت احمد لنگر دریا اپنے جد امجد حضرت نوشہ توحید کی طرح فارسی زبان کے ایک مستند صاحب دیوان شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً جملہ اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل سرا کی حیثیت سے وہ زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں اور اس صنف میں ان کی قدرت وتر دستی لائق تحسین ہے۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں استحکام و انسجام کے محاسن ملتے ہیں۔ معنی وہنر ان کے شعروں میں بڑی خوش اسلوبی سے ممزوج نظر آتے ہیں۔ ان کے دیوان میں تقریباً ایک سو غزلیں ہیں۔ چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں، بارہ رباعیاں، چار قطعات اور کچھ فردیات ہیں۔ معنوی لحاظ سے ان کی غزلوں میں تنوع ہے۔ عارفانہ مطالب کے باوصف ان کی غزلوں میں عاشقانہ، فلسفیانہ اور ناصحانہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ ان کے اشعار کا فنی نظام محکم واستوار ہے۔ یہ اشعار بیان ومعنی کے مکارم سے آراستہ ہیں۔ بلاغت وعروض کے آلات وموجبات بنحو احسن مستعمل ہوئے ہیں۔ احمد لنگر دریا نے سعدیؔ وحافظؔ کی تقلید میں متعدد غزلیں کہی ہیں اور یہ تقلیدی کوشش اکثر شایستہ تحسین نظر آتی ہیں۔ حافظؔ کی زمین میں کہی ہوئی ایک غزل کے کچھ اشعار شرح ذیل ہیں:

ہر آن نفس کہ نہ با دوست می زنم باد است — خنک دلی کہ بدیدار دوستان شاد است

من آن نیم کہ بہ سختی زیار برگردم — کہ ترک صحبت شیرین نہ کار فرہاد است

مگر تو حور بہشتی بدین لطافت وحسن — کہ این جمال نہ در خوی آدمی زاد است

دریغ جان گرامی کہ می رود احمد — بنای عمر ببین سخت سست بنیاد است

یہ اشعار حافظ کی غزل کی تقلید میں ہے جس کے چند اشعار اس طرح ہیں:

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است — بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است
غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود — ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

احمد لنگر دریا کی ایک دوسری غزل کے اشعار حافظ شیرازی کی زمین میں بقرار ذیل ہیں:

گر شاہدان ز پردہ رخ خویش واکنند — صد فتنہا بجان من بی نوا کنند
گر مطربان ز پردۂ عشاق چنگ را — سازی دہند بر دلِ ما خود چہا کنند
یا بد شفا ز دردِ فراق تو جان من — گر شربتی ز شکرِ لعل شما کنند
یارب چہ سخنہاست در آن جاویدان شوخ — کز غمزہ جانِ مردم از تن جدا کنند
ترکان جنگجوی دو چشمت بصلح باز — آیا بود کہ بامن مسکین صفا کنند

یہ اشعار حافظ کی اس جمیل و جاذب اور فکر انگیز غزل کی پیروی میں کہے گئے ہیں جس کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند — آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند
دردم نہفتہ بہ ز طبیبان مدعی — باشد کہ از خزانۂ غیبم دوا کنند
معشوق چون نقاب زرخ درنمی کشد — ہر کس حکایتی بتصوّر چرا کنند

سعدی کی ایک غزل کی زمین میں احمد لنگر دریا کی غزل کے کچھ اشعار بطور ذیل ہیں:

ای کہ شکلت ہر زمانی طرز دیگر میشود — یعلم اللہ زین تشکل عقل ابتر میشود
از جمالِ صبغۃ اللہ عالمی پر رنگ ہست — ہر کجا تو بینی دوست آنجا مصور میشود
گرچہ کارم درگرہ چون زلف تو افتادہ است — لیک از رویت مرا صد فتح دیگر میشود
ای بعشقت روز و شب ہر جا کہ باشم بالیقین — ہر طرف در دیدہ ام نقشت برابر میشود
تا کہ نور روی پاکت دید احمد بالعیان — بت پرستی زان سبب ویرا میسر میشود

سعدؔی کی غزل جس کی پیروی میں یہ اشعار موزون ہوئے، اس کے چند

اشعار اس طرح ہیں:

آ نکہ نقش دیگری جای مصور می شود نقش او در چشم ما ہر روز خوشتر میشود
عشق، دانی چیست سلطانیکہ ہرجا خیمہ زد بی خلاف آن مملکت بروی مقرر میشود
دیگران را تلخ می آید شراب جور عشق ماز دست دوست میگیرم و شکر میشود

احمد لنگر دریا کی غزلوں میں بحر و قافیہ کی تقلید کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان کے جہانِ معانی میں ابداع ونو آوری کے بھی عناصر ہیں۔ ان کے اشعار کے مفاہیم وموارد ان کے اپنے ذوق وقریحہ کا نتیجہ ہیں۔ ذیل میں سعدیؔ کی ایک دوسری غزل کی پیروی میں کہے گئے اشعار مثالاً پیش کیے جاتے ہیں:

زسودای غم عشقت چنانم کہ سر از پا و پا از سر ندانم
سراز دستیم خواہد رفت روزی ہمان بہتر کہ در پایت فشانم
مرا از بہر عشقت آفریدند چہ کاری دیگر است اندر جہانم
زمن روز قیامت ہرچہ پرسند بغیر از دوست نایر بر زبانم
بدہ کام دل احمد تو امروز کہ تا فردا بمانم یا نمانم

درج بالا اشعار شیخ سعدی کے درج زیرین اشعار کی تقلید میں ہیں:

مراتا نقرہ باشد می فشانم ترا تا بوسہ باشد می ستانم
دگر فردا بزندان می برندم بنقد این ساعت اندر بوستانم
جہان بگزار تا برمن سر آید کہ کام دل تو بودی از جہانم

احمد لنگر دریا کے اشعار کے مطالعہ سے یہ متصور ہوتا ہے کہ نویں صدی ہجری کے فارسی سخن گویوں میں وہ درخور اعتنا ضرور تھے۔ اگر چہ ہیئت وموجبات ہنری میں انھوں نے فارسی کے معروف شاعروں سے استفادہ کیا تھا لیکن معانی ومطالب کے مورد میں وہ زیادہ محتاج نظر نہیں آتے۔ معنی یابی ان کے شعری مختصات کا ایک عنصر ہے۔ ذیل میں ان کے کلام کی قدر و قیمت کو سمجھنے اور نویں صدی ہجری کے شعراء کی صف میں ان کی

حیثیت کے تعین کے لیے ان کی چند غزلیں نقل کی جاتی ہیں:

آتش عشق تو ناگہ بر فروخت — رطب و یابس ہر چہ مارا بود سوخت
چست آمد برتنم یکتای عشق — گرچہ خیاط ازل بس جامہ دوخت
زاہدی دیدم کہ در بازار عشق — نقد صد سالہ بہ جامی می فروخت
ذرّہ از آتش مہر رخت — در دل ہر خام گان افتادہ پوخت
سوخت از احمد ہمہ پندار وی — آتش عشق تو ناگہ برفروخت

....

ای کہ شراب لعل تو کردہ مرا مدام مست — ناوکِ غمزہ ہای تو جان دل مرا بخست
ای از شراب لعل تو جملہ جہان خراب ہست — جام جہان نمای تو کردہ مرا مدام مست
ہر کہ خورد شراب را داند او قدر لعلِ تو — زانکہ مجاز فی المثل قنطرۃ الحقیقت است
ہر چہ بود ز غیر تو رطب و یابسی بمن — چون تو تجلی ای کنی نیست شود ہر چہ ہست

....

ای خوش آنروز کہ من روی ترا خواہم دید — مظہر ذات و صفتہای خدا خواہم دید
حاصل از عمر ہمان روز مرا خواہد بود — کہ من گم شدہ ہر لحظہ ترا خواہم دید
کی بدست منِ بی مایہ رسد این دولت — کہ سر خویش تہ پای شما خواہم دید
گرچہ ای سروز بالای تو ہر لحظہ بلا است — مرو از پیش کہ ہر لحظہ بلا خواہم دید
بلبلی دوش ہمی گفت بگل وقت سحر — در خزان بی تو بسی خار جفا خواہم دید
از میٔ صاف صفا یافت دلم چون احمد — ساقیا روی تو در جام صفا خواہم دید

....

ملک دنیا ترک دادن کار شاہانست بس — سر فدا کردن طریقِ کج کلاہانست بس
چرب وشیرین راہمہ کس دوست می دارد یقین — بادہ ہای تلخ خوردن کار مردانست بس
زن بود آن کو مرادِ خویش خواہد دایما — نامرادی پیشہ کردن کار مردانست بس
بندگیٔ حق بکن احمد مراد خود مخواہ — آنکہ او بخشد مرادت کار یزدانست بس

....

عمر ضایع گشت ازمن ای دریغا چون کنم — جای آنست چشم رامن چشمہ جیحون کنم
بالیقین جان وجگر را در ہوای روی تو — آب گردانیم ودل راقطرہ ای ازخون کنم
بارہا می خواستم کین جان کنم قربان تو — لیک این باراست ای دل ہان بگوا کنون کنم
زیر طوفان باشد این جملہ زمین تا آسمان — قطرہ ای از چشم خود گر یکدمی بیرون کنم

حضرت احمد لنگر دریا نے کچھ ترانے بھی منظوم کیے ہیں (دوبیتی) جو معنوی حیثیت سے بہت زیادہ اہم نہیں ہیں۔ یہ ترانے فکر انگیز نہیں ہیں اور معنوی لطائف سے عاری ہیں۔ تاہم اس صنف میں ان کی مساعی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

بحسن شکل موزونت بشر نیست — بشیرینی لب لعلت شکر نیست
مکش ای ترک بر ما تیرِ غمزہ — کہ تیر غمزہ ات را خود سپر نیست

....

سلامت باش ای مرد سلامت — نیازردہ دلی از لطف عامت
چنانک این خلق از تو ہست فارغ — توہم فارغ تری برگیر کامت

....

لبت یاقوت و مرجانست لب نیست — دہد گر قوت مرجان را عجب نیست
لب تو بر لبم گہ گہ رسیدہ است — سخن شیرین کہ دارم بی سبب نیست

....

عروس غیب کہ مستور بود از دیدار — ببیں چگونہ تجلی بکرد فصل بہار
بہر طرف کہ بہ بینی خطاب حق شنوی — کہ انظروا بجمالی یا اولی الابصار

....

خرم آنروز یکہ بکنم من سلام — دست بندم پیش تو ہمچو غلام
تو برسم خواجگان اندر قعود — من طریق بندگان اندر قیام

مسئلہ وجود سے متعلق حضرت احمد لنگر دریا نے ایک معنی خیز قطعہ منظوم کیا ہے

جس میں وہ اظہار خیال فرماتے ہیں کہ کاش کہ میں عالم وجود میں نہیں آتا، کیونکہ میرے وجود کے سبب بہت سارے آلام ومصائب، آفات وفسادات ظہور میں آئے۔ جب میں عدم میں تھا تو سکون وآسایش کے حال میں تھا اور ما ومنی کے اندیشہ وخیال سے یکسر فارغ تھا۔ چند اشعار اس قطعہ کے بشرح ذیل ہیں:

کاشکہ ہرگز نبودی این وجود کز وجود ما بلاہا رخ نمود
در عدم آسودہ بودم برق وار فارغ از ما و منی در کاروبار
ایمن از آشوب و فتنہ در بلا بی غم از تشویش خوف و از رجا
باہزاران فرحت شادی وشور بافراوان بہجت و عیش و سرور
کز خلائق جمع اندر سر بسر تا از آن عالم یکی گوید خبر
آخر الامر این ہمہ خیزان شوند از صفات آنجہان طیران شوند
از عدم موجود کردی مرمرا در وجود خویش دادی صد عطا
ہرچہ دارم از تو دارم در وجود جامۂ جان ہرچہ ہست از تار وپود

حضرت احمد لنگر دریا بلخی کے بعد بہار شریف میں سلسلۂ فردوسیہ کے سجادہ نشیں بزرگوں میں چند ہی ایسے مشائخ منصۂ ظہور پر آئے جو تصوف وعرفان کے وجدان و بصیرت کے ساتھ ساتھ شعر وادب کا بھی نہایت نفیس ولطیف ذوق رکھتے تھے۔ حضرت احمد لنگر دریا کے عہد کے بہت بعد تیرہویں صدی ہجری میں مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہونے والے دو بزرگ حضرت مخدوم شاہ امیر الدین فردوسی اور حضرت شاہ امین احمد فردوسی ادب وعرفان کے دونوں میدان میں اپنی فخامت وعظمت کا ثبوت دیا۔ احمد لنگر دریا بلخی کے فرزند حضرت ابراہیم سلطان بلخی فردوسی جو اپنے والد ماجد کے سرچشمہ علم و ادب اور عرفان و ایقان سے زیادہ مستفیض نہ ہوسکے۔ ان کی وفات ۱۹/ رمضان المبارک ۹۱۴ھ میں ہوئی۔ حضرت ابراہیم سلطان بلخی فردوسی کے بعد شاہ امیر الدین فردوسی سے پہلے جو بزرگان صاحب سجادہ ہوئے ان کے اسماء گرامی بقرار ذیل ہیں: شیخ

درویش بلخی فردوسی، شاہ محمد بھیکھہ فردوسی، شاہ جلال فردوسی، شاہ آخوند فردوسی، شاہ محمد فردوسی، شاہ احمد فردوسی، دیوان شاہ علی فردوسی، شاہ عبدالسلام فردوسی، شاہ ذکی الدین فردوسی، شاہ وجیہ الدین فردوسی، شاہ بدیع الدین فردوسی، شاہ علیم الدین فردوسی اور شاہ ولی اللہ فردوسی۔

ان میں سے بعض بزرگوں کی بابت شاہ نجم الدین فردوسی نے اپنی کتاب ''حیات ثابت'' میں ان کے اخلاقی اوصاف، عبادت وریاضت، اوراد و وظائف اور کردار واطوار کے مکارم کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً شاہ محمد بھیکھہ فردوسی، دیوان شاہ علی فردوسی کے مزاج ومذاق کی خوبیوں کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ حضرت وجیہ الدین کے بارے میں مصنف ''حیات ثبات'' نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں مخدوم الملک کی خانقاہ کے اخراجات کے لیے فرخ سیر نے متعدد مواضع نذر کیے تھے۔ حضرت شاہ علیم الدین درویش فردوسی کی بابت نجم الدین فردوسی نے لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں مہاراجہ شتاب رائے اور کلیان سنگھ بھی اکثر مخدوم الملک کے عرس میں شریک ہوتے تھے اور فقرا و مساکین خانقاہ کے درمیان نقد وجنس تقسیم کرتے تھے۔ حضرت شاہ علیم کے نام متعدد فرامین خانقاہِ مخدوم الملک میں محفوظ ہیں جو سلاطین دہلی نے جاگیریں نذر کرنے کے لیے ارسال کیے تھے۔ ان میں سے ایک فرمان کو شاہ نجم الدین فردوسی نے اپنی کتاب ''حیات ثبات'' میں نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

> ''متصدیان مہمات حال واستقبال پرگنہ بیسوک سرکار صوبہ بہار بدانند کہ چون برطبق فرمان والا شان واجب الاذعان مسطور است۔ یکم شہر رمضان المبارک موضع مظفر پور وغیرہ از پرگنۂ مذکور کہ دوہزار، یک صدوسی ودوروپیہ حاصل آن است من ابتدای ربیع مطابق ضمن دروجہ درگاہ مخدوم الملک عوض وکالت نامہ بنام حقائق ومعارف آگاہ سید علیم الدین درویش بافرزندان مقرر گشتہ باید کہ مواضعات مذکورہ من ابتدای مسطور بروفق فرمان

والا شان نسلاً بعد نسلٍ و بطناً بعد بطنٍ خالداً و مخلداً درجہ نیاز درگاہ
مخدوم عوض وکالت نامہ بنام مشار الیہ با فرزندان مقرر دانستہ
بتصرف او و فرزندانش واگذارند واز ضوابط تغیر و تبدل مصئون
ومحروس اعتبار نمودہ بعلت پیش کش صوبہ داری و فوجداری و مال و
جہات و اخراجات مثل قلعہ ومحصلانہ و داروغانہ وشکار و بیگار رودہ نیمی
مقدمی وصدوری قانون گوئی مزاحم ومعترض نشوند و از جمع عوارض
معاف و مرفوع القلم شناسد۔ درین باب تاکید اکید دانستہ ہر سال
سندِ مجدد نہ طلبند تاریخ دہم ذی قعدہ ۵ھ جلوس قلمی شد۔''

شاہ عالم بادشاہ نے اپنے ایک مکتوب میں مسٹر جوزف جیکل بہادر سے سفارش کی تھی کہ وہ حضرت شاہ علیم الدین درویش کا احترام کریں اوران کے احوال پر خصوصی توجہ فرمائیں۔ یہ خط بھی خانقاہ مخدوم الملک میں محفوظ ہے۔ بہر حال جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مرقوم ہوا، حضرت احمد لنگر دریا کے بعد حضرت شاہ امیر الدین فردوسی کے ظہور سے قبل کے عرصے میں جو بزرگان فردوسیہ مسند سجادگی پر متمکن ہوئے۔ ان میں سے کسی کی بابت صاحب تصنیف ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ بہار کے فردوسیہ سلسلے میں یہ عرصہ علمی و ادبی اعتبار سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔ اس عرصے میں ظہور میں آنے والے بزرگوں کے بارے میں جو اطلاعات فراہم ہوتی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات کے بیشتر اوقات رسومات خانقاہ کے اجرا میں گزرتا تھا اور معاملات دنیوی کی الجھنیں ان پر مستولی رہتی تھیں۔ مسند سجادگی پر وراثتاً ایک بزرگ کی وفات کے بعد دوسرے کا متمکن ہونا ایک روایت تھی۔ چنانچہ اختصاصات روحانی اور صفات اخلاق سے عاری حضرات سجادہ نشین ہوجاتے تھے۔

مشائخ خانقاہ کا دانش وعرفان سے عاری ہونا خانقاہی نظام کے تدریجی تنزل و انحطاط کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب طبقۂ علما میں صدق و اخلاص مفقود ہوگیا اور خود بینی وخود خواہی، شقاوت و بے رحمی ان کے اطوار و اعمال سے ظاہر ہونے لگیں اور وہ احکام

شرع کی مغرضانہ تاویلیں کر کے صلحاوعرفا کو اپنے حقد وحسد کا نشانہ بنانے لگے تو درویشان حق بین وحق گو کی اس جماعت نے ایسی شدت ونامردمی، جوروبے مروتی کے ازالہ کے لیے صبر وشکیب، اخوت ومحبت، حلم وبردباری، سعۂ نظر اور عفوودرگذر کا بشر دوستانہ پیغام دیا۔ صلحا کی یہ تحریک جو عام انسانوں کی سعادت اور خیر وبرکت کے لیے تھی آگے چل کر ایک منظم سازمان کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ تمام بنی آدم سے محبت کرنے والی اس جماعت کے بزرگان اپنے اپنے طریقے سے عوام کے ارشادوہدایت کے کام میں مشغول ہوگئے۔ چنانچہ اس کارنیک کی انجام دہی کے لیے متعدد سلاسل ظہور میں آئے۔ مثلاً سہروردیہ، چشتیہ، قادریہ، نقش بندیہ، شطاریہ اور فردوسیہ وغیرہ۔ علما ایک طرف عقاید کے مسائل میں اختلاف نظر کے سبب ہمیشہ لاحاصل مشاجرات ومناقشات میں مصروف رہتے تھے اور آج بھی یہ گروہ شدید مسلکی اختلافات کی زد میں ہے۔ اور دوسری طرف صوفیوں کی جماعت سے انھیں متصلاً عداوت رہی۔ منصور حلاج، سرمد شہید، جناب جعفر صادق، احمد بہاری اور حضرت عز کاکوی اور نہ معلوم کتنے روشن ضمیر صاحب دلوں کو تنگ دل اور کینہ توز ملاؤں نے محضر میں طلب کر کے، پوچ وبے معنی الزامات کا مورد بنا کر گردن زدنی قرار دے دیا۔ سلطان وقت کو مشورے دینے والے ان فقیہوں نے حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد منیری کو بھی معاف کرنے کو آمادہ نہیں تھے۔ احمد بہاری اور عز کاکو یہ مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق غیر متوازن اور غیر سنجیدہ خیال کے برملا اظہار کے اتہام کے نتیجے میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ مخدوم الملک کو سلطان کا یہ عمل ناگوار گزرا۔ انھوں نے اس واقعہ پر اپنے تنفر کا بڑی بیباکی سے اظہار کیا۔ حضرت مخدوم الملک کے اس ردعمل کی خبر جب سلطان کو ملی تو دربار سے وابستہ علماء نے ان سے باز پرس کے لیے دربار میں طلبی کا فرمان جاری کروایا لیکن خوش بختانہ حضرت مخدوم جہانیان جلال بخاری کی فہمایش وشفاعت سے یہ آفت ٹل گئی اور حکم نامہ واپس لے لیا گیا۔

اسلامی تاریخ کے خوشایند وپسندیدہ واقعات جن سے دین مبین کے فروغ و

پیش رفت میں مدد ملی، صوفیوں کی تبلیغی مساعی شایستۂ توجہ ہیں۔ دین اسلام کی اصل و اساس اور اس کے مقصد و مشن کو بوجہ احسن سمجھنے والے ان بے لوث خدام دین معاشرہ کو فتنہ وفساد، اخلاقی پستی اور اضمحلال سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے دین کے مقصد و مفہوم کو سہل و سادہ الفاظ میں پیش کیا۔ ان کی زبان سے صادر ہونے والی تعلیمات جو صدق وصفا، صبر و رضا اور ومہر و الفت سے مشحون ہوتی تھیں، سامعین کے دلوں میں فی الفور اتر جاتی تھیں۔ غیر مسلموں پر بھی ان کی جانب سے دعوت اسلام کے مثبت و مراد بخش نتائج ظہور میں آئے۔ خصوصیت سے پائین و پست طبقات کے ہندو اُن کے مساوات و مواخات اور معاشرہ میں عدم تفریق و تمیز کے پیغامات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور شجر و حجر، اصنام اور اوہام کی پرستش کرنے والے ہنود جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ بختیار خلجی، سالار مسعود غازی، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری نے اپنی شمشیر و سنان اور تیر و کمان کا رعب و ہیبت حتماً ہند کے باشندوں کے دلوں پر بٹھا دیا لیکن یہ حملہ آور مبارزین اہل ہند کے دلوں کو جیتنے میں یکسر ناکام رہے۔ چنانچہ سلاطین خلجی و تغلق اور شاہان مغول یہاں سکون و استقلال کے ساتھ حکومت نہیں کر سکے۔ لیکن صوفیوں نے اہل ہند کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کی محبت آمیز موعظتوں کے نہایت مفید و مستحسن اثرات ان کے ذہن و ضمیر پر پڑے اور بت پرستوں کی یہ جماعت رضا و رغبت اور خلوص و صمیمیت کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔ اس امر سے متعلق علامہ اقبال کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

آن فقر کہ بی تیغی صد کشور دل گیرد

از شوکت دارا بہ، از فرِّ فریدون بہ

لیکن یہ اوائل دور کے صوفی تھے جن کے اعمال میں خلوص و شفافیت تھی۔ وہ ابلاغ دین و شریعت استرضائے خداوند متعال کے لیے کرتے تھے۔

ہندوستان میں حضرت عثمان ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، حضرت بختیار

کاکی، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، خواجہ گیسو دراز، سلسلۂ سہروردیہ کے شیخ بہاء الدین ذکریا، شیخ جلال الدین تبریزی، سلسلۂ فردوسیہ کے صوفی خواجہ بدر الدین، خواجہ نجیب الدین اور مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد منیری نقشبندیہ صوفی شیخ احمد سرہندی، سلسلۂ شطاریہ کے صوفی شاہ عبداللہ اور اس کے علاوہ دوسرے سلاسل کے بزرگوں نے اسلام کی تعلیمات کی بڑی توجہ کے ساتھ اشاعت کی۔ ان کی صمیمانہ مساعی کے نتیجے میں ہی شبہ قارّہ ہندو پاک میں دین اسلام کے ماننے والے نظر آتے ہیں۔

لیکن گذشتِ زمان سے صوفیوں کی راہ وروش اور کاروکوشش کے خلوص میں فقدان نظر آنے لگا۔ چند ہی صدیوں کے بعد خانقاہوں پر دنیا داری کا استیلاء ہوگیا۔ خانقاہیں جن نیک مقاصد کے لیے وجود میں آئی تھیں، بعد کی صدیوں میں آنے والے صوفیوں نے ان کو فراموش کر دیا۔ وہ راہ راست سے منحرف ہونے لگے۔ خانقاہوں میں صرف ظاہری رسومات کو ادا کر دینا وابستگان خانقاہ ضروری سمجھنے لگے تھے۔ سجادہ نشینوں کے قلوب ابلاغ حق کی اسپرٹ سے خالی ہو چکے تھے۔ جھاڑ، پھونک، دعا تعویذ ان کا پیشہ بن گیا تھا۔ اس کی محفلیں دھوم دھام اور تزک واحتشام کے ساتھ ضرور سجائی جاتی تھیں اور آج بھی سجائی جاتی ہیں اور نہایت پر تکلف ضیافتیں ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی پر تکلف نمایشوں کی موافقت صوفیوں کے مقصد حیات سے ہرگز نہیں ہوتی ہے۔ آخر انسانوں کے ذہن وضمیر کی آلایش وکدورت سے پاکسازی کا رشتہ ایسے افعال ذمیمہ سے کس طرح ہوسکتا ہے۔ آج کے صوفی اخلاقی پستی سے دوچار ہیں اور خانقاہیں نیرنگ وفسون کی کمین گاہیں بن گئی ہیں۔ علامہ اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

در دیر مغان آئی مضمون بلند آور

در خانقہ صوفی افسانہ وافسون بہ

چنانچہ امام ابوالقاسم قشیری احوال واقعی کے ملاحظہ کے بعد خبر دار کرتے ہیں:

''ہر وہ تصوف جس کے ساتھ پاکیزگی اور پارسائی نہیں فریب ہے، تکلف ہے، مگر تصوف نہیں۔ ہر وہ باطن جس کا ظاہر مخالف ہو باطل ہے، باطن نہیں۔ ہر وہ فقر جس کو صبر وقناعت کے ساتھ مضبوط نہ کیا گیا ہو بدبختی اور محرومیت ہے، فقر نہیں۔ اور ہر وہ علم جس کی تصدیق عمل سے نہ ہو جہل وظلم ہے، علم نہیں۔ اور ہر وہ توحید جسے کتاب وسنت صحیح قرار نہ دیں الحاد ہے نہ کہ توحید۔''

سازمان تصوف میں جب اضمحلال وانتشار کی کیفیت پیدا ہوئی تو کچھ ایسے متصوفین (صوفیوں کی نقل کرنے والے) ظہور میں آئے جو اپنے لیے احکام شرع کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ خدا رسیدہ ہو چکے ہیں۔ عبادت وریاضت کے تمام مراحل سے گزر چکے ہیں، لہٰذا دین وشریعت کے فرائض پر عمل کرنا ان کے لیے لازم نہیں۔ ایسے گمراہ کن خیال کو حضرت عثمان ہجویری، مولانا روم اور دوسرے صوفیان صادق دائرۂ دین وایمان سے بیرون تصور کرتے تھے۔

بہر حال بہار میں احمد لنگر دریا کے بعد سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگان کے ذریعہ ایک طویل مدت تک ادب وعرفان سے متعلق کسی کارنامے کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ شاہ امیر الدین فردوسی کے عرصۂ وجود میں آنے سے پہلے تک ایک حیران کن اور غور طلب جمود وسکوت کی صورت نظر آتی ہے۔

حضرت شاہ امیر الدین فردوسی:

حضرت شاہ امیر الدین جو مخدوم شاہ ولی اللہ کے فرزند وخلیفہ تھے ۹ محرم ۱۲۱۷ھ کو متولد ہوئے۔ علوم متداولہ کی تعلیم حضرت امیر الدین نے شاہ قطب الدین خلیفۂ حضرت مخدوم شاہ منعم پاک سے حاصل کی تھی اور علوم عرفانی کا اکتساب شاہ حسین علی شطاری کی خدمت میں کی۔ جن سے انھیں سلسلۂ شطاریہ میں شرف بیعت بھی حاصل ہوا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے والد محترم کی وفات کے بعد خانقاہ مخدوم الملک کے سجادہ

نشین ہوئے۔ ان کی نوجوانی کے ایام غیر مشروع طور پر گزرے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے توبہ کرلی تھی اور حضرت شاہ علی شطاری کی ہدایت وارشاد سے ان کی زندگی میں تغیر پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ شاہ ابوالحسن اور حضرت شاہ حمید الدین راجگیری کی پر میمنت صحبتوں سے وہ بہرہ مند ہوئے۔ پارسائی و پرہیزگاری ان کی طبیعت کی خاصیت تھی۔ نماز تہجد اور دوسری نفل عبادتیں بڑی پابندی سے گزارتے تھے۔ طبیعت میں کسر نفسی و فروتنی تھی۔ تکلف وتصنع سے انھیں نفرت تھی۔ سماع کی مجلسوں میں ذوق وشغف کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور کبھی کبھی دل انگیز شعر کی سماعت کے تحت تأثیر ان پر وجد و حال بھی طاری ہوجاتا تھا۔ ان کے اوقات بیشتر اورادو وظائف اور عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ شعر گوئی کا نہایت بالیدہ وسنجیدہ ذوق رکھتے تھے۔ اور فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے متصوفانہ خیالات کی ترسیل اپنے شعروں کے وسیلے سے کرتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص ظلوم تھا اور اردو میں وجد تخلص کرتے تھے۔ دونوں زبانوں کی بیشتر شعری اصناف میں حضرت امیر نے فکر انگیز اشعار لکھے ہیں۔ ان کے فارسی دیوان میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن پر شیخ علی حزیں کے کلام کی پیروی کے نشانات ملتے ہیں۔ چند فارسی اشعار مثالاً پیش کیے جاتے ہیں:

طاق ابروی کسی قبلۂ عشاق آید — کہ دراین بتکدہ آن رشک صنم طاق آید
گر بدیوانگیٔ عشق بگیرند بحشر — ہر حسابی کہ تو گوئی ہمہ بیباق آید
تار شیرازہ نہ بخشد اگر آن طرۂ ناز — نسخہ دھر پریشان شدہ اوراق آید
بی حجابانہ چو خود بر لب بام آئی — ہمہ عالم بہ تماشای تو مشتاق آید
برسر جمع غم عشق تو می بازم فاش — حسن گردی تو تاشہرۂ آفاق آید
تلخ کامی محبت ہمہ چو شہد بگیر — ای بسا زہر دراین شیشہ کہ تریاق آید
ساقیازان می تندی دوسہ جامم بجشی — کہ دماغ من مخمور دمی چاق آید

شاد روئی رقیبانِ برومند وصال — چون نہ غم دیدۂ ہجران ترا شاق آید

کرد طرحِ غزل سعدی شیراز ظلوم

اگر آ ن عہد شکن برسر میثاق آید

....

گر عشق کسی خواہی میکش تب وتاب اول — تا نشہ کند پیدا چون شدمی ناب اوّل

داری ہوس زلفش بنشین بسر کویش — چون گرد وغباری شو برباد خراب اول

دیوان محبت کی گیرد ز اثر رنگی — برنام تو تا نبود آغاز کتاب اول

گر شہرتِ حسن ای جان منظور نظر داری — بردار نقاب از رخ بگذار حجاب اول

غش کردۂ بویت را ای کاش پی دارو — از خوی تو ای گل رو پاشند گلاب اوّل

من بعد ازاین غمہا جان رفتہ زتن بیرون — خواب وخور وعقل ودین دادند جواب اوّل

خواھند چو برگیرند از کردہ حساب من — از عشق جنون کامی گیرند حساب اول

یارب چہ رہست این رہ رفتن نتوان آخر — پا آبلہ پر آید مانند حباب اوّل

در طی سلوک ای دل برعقل بود کارم — از میر رہی پرسم گر راہ صواب اوّل

این آن غزل صائب کش مصرعہ ظلوم این است — گر تشنۂ اسراری پیش آر شراب اول

....

ربط است شیخ را وبرہمن ہم آشناست — دارم بتی کہ محرم و نامحرم آشناست

باگریہ با بساز کہ تاخندہ روشوی — چون لالہ ای کہ داغ دلش باغم آشناست

بیگانۂ من است یگانہ بہ ہرکسی — ناآشنای ماست کہ یک عالم آشناست

خوش مصرعۂ ظلوم زگفتار صائب است — یک آشنای بامزہ یک عالم آشناست

رباعی

دندان بہ جگر پارہ فشردن باید — خونِ دل خود ظلوم خوردن باید

لیکن نہ بہ کوچہ ہای دونان ہرگز — مانند سگ استخوان شمردن باید

ایک ترجیع بند کے کچھ اشعار بقرار ذیل ہیں:

بادۂ گلرنگ نوش و شاد باش　　از ہمہ بند جہان آزاد باش
پوست برکن گردنش زن بیدرنگ　　بہر این گرگ کہن جلاّد باش
آنچہ از دستت رود روزی ضرور　　ہرچہ شد برباد گوہر بادباش
بہر خون ریز رگ سودای حرص　　تیز تر چون نشتر فستاد باش
مثل دونان بہر دنیای دنی　　عقل کی کوبد در فریاد باش
برلب جوی درین میخانہ مست　　خواجۂ شیراز رکنا باد باش

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک برسر کن غم ایام را

مختلف اصناف میں کہے گئے حضرت امیر کے اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک قادر الکلام شاعر تھے اور انھیں اپنے ہم عصر سخنگویوں پر فوقیت حاصل تھی۔ عہد اورنگ زیب میں عبدالقادر بیدلؔ عظیم آبادی بلا شبہ ایک ایسے ارجمند شاعر تھے جنھوں نے سبک ہندی کے مختصات کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا تھا اور اپنے اشعار میں معنوی نزاکت اور فکری رفعت کا ایک ایسا معیار پیش کیا جس کی تقلید بعد کو آنے والے شعرا سے نہ ہو سکی۔ بیدلؔ کے بعد کا زمانہ ہندوستان میں اردو شاعری کی مقبولیت اور عروج و اعتلا کا زمانہ تھا اور فارسی شاعری مائل بہ تنزل ہو چکی تھی۔ بیدلؔ کے بعد ہندوستان میں اوسط درجہ کے فارسی شعراء منصۂ ظہور پر آئے۔ ان میں آرزوؔ اکبر آبادی، واقفؔ لاہوری، آزادؔ بلگرامی، حاکمؔ لاہوری، فاخرؔ مکین، قتیلؔ لکھنوی، پیارے لعل الفتیؔ، راجہ رام موزونؔ، خورشیدؔ بلگرامی، افتخار الدین ذرہؔ، غالبؔ دہلوی، ثروتؔ پھلواروی، فردؔ پھلواری، حسرتؔ عظیم آبادی، یاسؔ آروی، تائیدؔ عظیم آبادی فائزؔ پھلواروی وغیرہ ہیں۔ لیکن ان سبھوں میں غالبؔ دہلوی ہنر ومعنی دونوں اعتبار سے سب سے زیاہ قادر و توانا ہیں اور انھیں اوروں پر ارجحیت حاصل ہے۔

بہر حال، حضرت امیر الدین ظلوم تیرہویں صدی ہجری کے شاعر تھے اور اس

زمانے میں ہندوستان میں فارسی شاعری کا جو معیار و مذاق تھا، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان کے اوسط درجے کے شاعروں میں درخور اعتنا ضرور تھے۔ مختلف اصناف شعر میں ان کے اشعار سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت امیر اردو زبان کے بھی ایک مستند شاعر تھے اور وجد تخلص کرتے تھے۔ اور عظیم آباد کے معروف اردو شاعر راسخ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے اردو مجموعۂ کلام سے بھی کچھ اشعار یہاں پر نقل کیے جاتے ہیں:

منظور نظر کون ہے اب تم سے زیادہ — رکھے جو عزیز آنکھوں میں مردم سے زیادہ
پوشیدہ نہیں عشق کے دریا کا تلاطم — یہ بحر خطرناک ہے قلزم سے زیادہ
خندہ سے تبسم ترا قاتل ہے فزوں تر — جی لینے میں چمکے ہے تکلم سے زیادہ
توقیر ہر ایک چیز کی ہے اپنی جگہ میں — کمّل کی کہیں قدر ہے قاقم سے زیادہ

حضرت امیر الدین فارسی کے ایک ماہر و معتبر شاعر ہونے کے باوصف شیخ طریقت کی حیثیت سے بھی اپنے تقویٰ و پارسائی، ریاضت و عبادت کی بنا پر خاصان و عامیان کے درمیان عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت امیر کا وصال ۵/جمادی الاول ۱۲۸۷ھ کو ہوا اور آستانۂ مخدوم الملک میں مدفون ہوئے۔

شاہ امین احمد فردوسی:

شاہ امین فردوسی خانقاہ بہار شریف میں ۲۲/رجب ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۷/دسمبر ۱۸۳۲ء کو متولد ہوئے۔ 'اختر مجد' اور 'بخشش الٰہی' حضرت شاہ امین کی ولادت کی تاریخ کے مادّے ہیں۔ جو حضرت شاہ امیر الدین فردوسی پدر شاہ امین کے کہے ہوئے درج ذیل قطعہ میں مستعمل ہوئے ہیں:

من بعد آرزو ہا چون من بہ نور دیدہ — فائض بہ کام گشتم از فیض لاتناہی
گفتا خرد کہ سالش جوئی ز ''اختر مجد'' — تاریخ میتوان گفت ہم ''بخشش الٰہی''

حضرت امین احمد متخلص بہ ثبات نے ابتدائی تعلیم مولوی عنایت حسین ساکن

موضع بھنڈاری سے حاصل کی۔ پھر مولوی عبدالرحیم سے عربی کی مقدماتی کتابیں پڑھیں۔ سن شعور پر پہنچنے کے بعد موصوف نے فقہ کی تحصیل مولانا سید وزیر الدین کے حضور میں کی۔ پھر مولانا موسی، جو اس زمانے میں ظاہری و باطنی علوم کے ایک معروف استاد تھے، سے علوم متعارفہ اور سلوک وعرفان کی تعلیم حاصل کی۔ اور باطنی علوم خود اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاصل کیے۔

حضرت امین احمد ثبات جس روز مسند سجادگی پر متمکن ہوئے، جناب حضور کے لقب سے ملقب ہوئے۔ اگرچہ خانوادۂ فردوسیہ کے سجادہ نشینوں میں کسی کا یہ لقب نہیں رہا ہے۔ حضرت کی زندگی میں ان کی جو کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں تھیں ان کے ٹائٹل کور پر بھی یہ لقب ان کے اسم گرامی کے ساتھ موجود ہیں۔

حضرت امین فارسی کے ایک جلیل القدر شاعر ہونے کے باوصف اردو میں بھی فکر سخن کرتے تھے۔ فارسی میں ثبات تخلص کرتے تھے اور اردو میں متخلص بہ شوقؔ تھے۔

حضرت امین احمد ثبات تیرہویں صدی ہجری میں صوبہ بہار میں فردوسیہ سلسلہ کے ایک عظیم المرتبت صوفی تھے۔ ان کی شخصیت ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ تھی۔ حضرت ثبات کا زمانۂ حیات سیاسی اعتبار سے نہایت پُر آشوب تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کا رسوخ ونفوذ، غلبہ و دبدبہ کمزور ہو چکا تھا اور سلطنت مغلیہ کا نظام انحطاط و انقراض کے مرحلے میں تھا۔ انگریز یہاں بتدریج اپنی قوت وشوکت کو بڑھا رہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان اخلاقی طور پر پست، بدحوصلہ اور مایوس و منتشر تھے۔ ہندوستان کے دوسرے اطراف وایالات کی طرح بہار میں بھی مسلمان کا حال بھی نہایت مبتذل تھا۔ ایسے دور میں جب کہ اوضاع کشور ہند بے حد نامساعد تھے، حضرت ثبات کا وجود وظہور غنیمت تھا۔ وہ اپنے اخلاق و کردار، باطنی اوصاف، دانش وادب اور روحانی بصیرت کے لحاظ سے اس دور کے دوسرے مشائخ سے بہت مختلف تھے۔ ان کے دین ودنیا کے تمام معاملات میں خلوص تھا۔ ان کی شخصیت پر بزرگان سلف کے مکارم کا پرتو تھا۔ وہ

اپنے علم وعرفان کی بنا پر مشائخ گذشتہ سے مشابہت رکھتے تھے۔حضرت ثبات نے مختلف الجہت شخصیت کے انوار واشراق سے ہندوستان کے طول وعرض میں بسے ہوئے خوار وزبوں حال مسلمانوں کو اخلاقی و روحانی حوصلہ دیا۔ انھوں نے اس ملک کے مسلمانوں کے مذہب وثقافت پر فرنگیوں کے تجاوز وتعدی کا مسالمت آمیز طریقے سے مقابلہ کیااور اپنی تہذیب کے تشخص کومحفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔حضرت کی شخصیت چہار سو، ماحول میں پھیلی ہوئی تاریکی میں نہایت تابناک نظر آتی ہے۔بعض اہل قلم حضرات نے جناب ثبات کی غیر معمولی شخصیت کا ذکر خصوصی طور پر اپنے آثار میں کیا ہے۔مولوی غلام نبی خان اپنی کتاب 'مراۃ الکونین' میں جو۱۸۹۵میں حضرت ثبات کی زندگی میں ہی اشاعت پذیر ہوئی،حضرت امین احمد ثبات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آپ صاحبزادہ جناب شاہ امیر الدین احمد قدس سرہٗ کے ہیں۔ بعد اپنے والد ماجد کے جانشین سجادہ مخدوم الملک علیہ الرحمۃ بہار شریف میں ہوئے۔اپنی زندگی ریاضت وفکر میں کاٹی۔ صابر ایسے کہ یادگار حضرت ایوب کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔کاسب بے مثل، مرتاض بیعدیل، شیخ وقت، یگانۂ روزگار ہیں۔ایسے مصائب دنیوی اور بلای آسمانی میں مبتلا ہوئے کہ اگر آسمان پر بھی وہ صدمے گزرتے تو پیش ازنشور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا مگر رضائے معبود میں ایسے صابر وثابت قدم رہے کہ آدمی کیا فرشتے بھی حسد کریں۔الغرض آپ کی ذات ایسی جامع صفات ملکوتی ہے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ،حق جلّ وعلا آپ کے وجود باجود کوزلہ خواران کے نصیبوں سے تادیر قائم و برقرار رکھے کہ ذات والا صفات ایک زینہ خدارسی کا طالبان حق کے لیے اس وقت اس زمانے میں ہے۔''

حضرت امین احمد ثبات خانقاہ مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے بیسویں صاحب سجادہ تھے۔ جیسا کہ صفحات گذشتہ میں ذکر کیا گیا، تیرہویں صدی ہجری میں سیاسی اوراجتماعی بدحالی اور ملک کے اطراف واکناف میں زوال وابتذال کے سبب خانقاہیں بھی پستی وزبونی کی طرف مائل تھیں۔ خانقاہوں کی تاسیس کا مقصد ارباب سجادہ بھول چکے تھے۔ ان کے قلوب انوار عشق سے خالی ہو چکے تھے۔ وہ خانقاہیں جہاں قلب کے اصلاح وارشاد کا کام بڑی سچائی سے انجام دیا جاتا تھا اب توجہ و خلوص کے فقدان کے سبب عام لوگوں کی نظر میں معتبر نہیں رہیں۔ ملک میں چند ہی خانقاہیں اس زمانے میں ایسی تھیں جہاں اب بھی ارشاد ورہنمائی کا کام انجام پا رہا تھا۔ ایسی ہی چند خانقاہوں میں بہار شریف کی خانقاہ مخدوم جہان تھی جس کی مسند سجادگی پر حضرت ثبات جیسا مرد مومن اور ولی کامل متمکن تھا۔ ان کی ہستی نکبت و بدبختی سے بھرے ہوئے ماحول میں ایک سراج منیر جیسی تھی۔ انھوں نے اپنی باطنی روشنی اور نصرت و حمایت ایزدی سے بگڑے ہوئے معاشرے میں اصلاح کی صورت پیدا کی اور گمراہوں اور غلط کاروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے نور باطن سے ان کے دلوں کو بدل کر راہ راست پر لایا۔

ارشاد وہدایت کے کارہائے عظیم میں لائق تحسین کامیابی ان کی روحانی بصیرت کا پرمیمنت نتیجہ تھی۔ اسی طرح ظاہری فضل ودانش میں بھی وہ قابل رشک حیثیت کے مالک تھے۔ فارسی ادب سے انھیں شغف تھا اور اپنے دور کے ایک مستند اور منیع الطبع شاعر تھے۔ حضرت مخدوم جہان نے جس طرح مفید ومعنی خیز متصوفانہ افکار کو نثر کی مختلف صورتوں میں مثلاً مکتوبات، ملفوظات، رسائل وکتب کے وسیلوں سے پیش کیا ہے، اسی طرح حضرت امین احمد ثبات نے بھی اپنے عارفانہ خیالات، روحانی تجربات و مشاہدات اور تصوف سے متعلق بہت سارے اسرار آمیز نکات کو مثنوی کے قالب میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد مثنویاں ہیں۔ لہٰذا ان کے فارسی اشعار کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے درخور توجہ ہیں۔ ان کی مثنویوں کی صوری ومعنوی اختصاصات کا جائزہ آنے والے صفحات میں لیا جائے گا۔

حضرت ثباؔت کی مثنویوں کی تعداد سات ہے۔جن کے نام بشرح ذیل ہیں:

۱-شجرات طیبات ۲-سلسلۃ الآ لی ۳-گل فردوس

۴-گل بہشتی ۵-روضۃ النعیم ۶-شہد وشیر

۷-عبرت افزا

شجرات طیبات: اس مثنوی میں مختلف سلاسل کے شجرات کا بیان ہے۔اس میں اشعار کی مجموعی تعداد ۸۰۷ ہے۔مثنویٔ ہٰذا میں حضرت ثبات کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ جو نہایت مصنوع اور مسجع عبارت میں تحریر ہوا ہے۔اس دیباچہ میں مصنف نے سببِ تصنیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ایک ماہ کی مدت میں یہ مثنوی منظوم ہوئی تھی۔۱۲۷۹ھ میں یہ مثنوی اشاعت وطباعت کے مرحلے سے گزری۔شجرۂ نقشبندیہ کے مشتملات میں بسم اللہ کے فضائل، در مدحِ باری عز اسمہ، آغاز شجرہ، اور مناجات شامل ہیں۔حمد ایزدمتعال بارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ان شعروں میں حضرت ثبات نے خداوند بزرگ و برتر کی ربوبیت اور اس کے عظمت وجلال کو بیان کیا ہے۔پھر شجرہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بہر مجازاً عرب و عین رب احمد بی بیم و محمد لقب

بہر امام ہمہ پیر و مرید حضرت صدیق شہیدالشہید

مناجات کے اشعار اس طرح شروع ہوتے ہیں:

بار خدایا تو کریمی کریم رحم بفرما کہ رحیمی رحیم

روز و شب از کاہلی افتادہٗ پیش بت نفس خود استادہٗ

اس کے بعد سلسلۂ شطاریہ کا شجرہ ہے۔اس شجرے کی ابتدا 'از بہر' سے ہوتی ہے:

ار بہر خلاصۂ دو عالم احمد ز جمیع خلق اکرم

از بہر علی کہ از ولایت شد خاتم نقطۂ ولایت

دوسرے عناوین بھی اس شجرہ کے شجرۂ نقشبندیہ کے مانند ہیں۔ اسی طرح دوسرے سلاسل مانند شطّاریہ، چشتیہ، فردوسیہ، قادریہ کے شجرات اس مثنوی میں مناجات کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

سلسلۃ الآلی:

شجرہ کے بیان میں حضرت ثبات کی یہ دوسری مثنوی ہے۔اس میں کچھ رباعیات وقطعات بھی شامل ہیں۔جن کو چھوڑ کر اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۱۳۵۰ ہے اور معروف سلاسل کی شاخوں کی شجرے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ مثنوی مطبع انوار محمدی لکھنو سے چھپی تھی۔اس مثنوی میں ۱۷ رباعیات بھی شامل ہیں جو حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی منقبت میں لکھی گئی ہیں۔کچھ رباعیاں مثالاً نقل کی جاتی ہیں:

ای روی خوش تو رشک خاور بادا — حسنت ہر روز وشب فزون تر بادا
چشمیکہ پی تصورت بند کنیم — از شمع جمال تو منور بادا

ای خاک درت برسرم افسر بادا — فیض عام تو سایہ گستر بادا
از بہر تو گویم من مسکین چہ دعا — بر روح تو صد درود اکبر بادا

ای رفعت وقدر تو نکوتر بادا — وقف خیل تو حوض کوثر بادا
در لیلۃ الاسریٰ ومقام محمود — جای تو در آغوشِ پیمبر بادا

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات کے عنوان کے تحت جو اشعار منظوم ہوئے ہیں ان میں سے چند بقرار ذیل ہیں:

طالب حسن و جمال رحمتم — تشنۂ آب زلال رحمتم
وہ ز ہمت ابروی دیوانہ ام — برجمال خویش کن دیوانہ ام

رفت آن خضر طریق حق کجا — اندر این صحرای رہ گم گشتہ تا
قبلۂ دل مصحف رویش کنم — کار خود بر طاق ابرویش کنم

کی بود یارب کہ در مستیِ شوق — جملہ بیخود گشتہ باصد شوق و ذوق
سر بپای رہبر راہی نہیم — وز جہان آغوش دلخواہی بود

حضرت امین احمد ثبات کی تیسری مثنوی کا نام ''گل فردوس'' ہے۔ یہ حضرت

ثباؔت کی طویل ترین مثنوی ہے۔ ۱۳۰۱ھ میں یہ مثنوی مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپی تھی۔ ثباؔت نے اس مثنوی کو ۱۲۹۸ھ میں نظم کرنا شروع کیا تھا اور ۱۲۹۹ھ میں یہ پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس مثنوی میں سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگوں کے مناقب ومحاسن بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت ثبات نے مناقب کے بیان میں حضرت مخدوم جہان شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کو اولویت دی ہے۔ اس مثنوی میں حضرت نجیب الدین فردوسی، حضرت رکن الدین فردوسی، حضرت بدرالدین سمرقندی، حضرت سیف الدین باخرزی اور حضرت نجم الدین کبریٰ کے بھی مناقب بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ثبات نے مخدوم جہاں کی زندگی کے اہم واقعات کو نہایت دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ بہیا اور راجگیر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں حضرت مخدوم کی ریاضت کشی، بہار شریف میں انکا ورود مسعود اور اقامت، ان کی تعلیمات اور روحانی تجربات کو حضرت ثبات نے شوق وسرگرمی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مثنوی میں حضرت مولانا بلخی کے احوال حیات منظوم ہوئے ہیں اور حضرت نوشہ توحید اور مخدوم شعیب کے بھی مناقب منظوم ہوئے ہیں یہ مثنوی بحر رمل کی ایک غیر سالم بحر 'فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن' میں منظوم ہوئی ہے۔ مثنوی کا آغاز تحمید ایزد متعال سے اس طرح ہوتا ہے:

داند از معرفت آن کس کہ دل آگاہ بود　　اینکہ در ارض وسما ذات یک اللہ بود
دگر اشیا کہ تو بنی ہمہ انوار وی اند　　صنع ہا دار دو عالم ہمہ آثار وی اند
بردہ در عالم حیرت عرفا را ز صفات　　کردہ سرگشتۂ وادیٔ تحیّر در ذات

نعت سرور کائنات کے بیان میں حضرت ثبات کی تراوشہائے ذہنی کی قدرو قیمت کو سمجھا جاسکتا ہے:

تخت لولاک لما را نتوان بود افسر　　بجز از افسرِ اعیان رسل خیر بشر
در جہان آنکہ بود سرور عشاق ہمہ　　خاک جاروب درش انفس وآفاق ہمہ
عارفان راہمہ باللہ کہ او تاج سرست　　آبروی عرفا بلکہ ازان خاک درست

انبیا را ز ازل در بر عصمت ز خدا　　کسوت خاص نبوت بہ طفیلش زیبا
اولیا را ہم از اقرار بگفتار حقش　　خلعت صدق وولایت بہ بدن از صدقش

گل بہشتی:

حضرت ثبات کی چوتھی مثنوی بعنوان ''گل بہشتی''، ہیئتی اعتبار سے میر نجات اصفہانی کی مثنوی ''گل کشتی'' کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ میر نجات اصفہانی متوفی ۱۱۳۶ھ نے مثنوی ''گل کشتی''، فن کشتی کے قواعد واصول کی بابت لکھی تھی۔ اس مثنوی کی زبان نہایت مشکل و مغلق ہے۔ اس لیے مختلف صاحبان شعروادب نے اس مثنوی کی شرحیں لکھی ہیں جن میں سراج الدین علی خان آرزو کی شرح وقیع ومعتبر ہے۔ حضرت ثبات نے نجات اصفہانی کی مثنوی کے فارم کی تقلید کی ہے۔ ورنہ موضوع ومفہوم کے اعتبار سے حضرت ثبات کی مثنوی ''گل بہشتی'' نجات کی مثنوی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔

''گل بہشتی''، جو ۱۲۹۷ھ میں منظوم ہوئی تھی، مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے۔ گل بہشتی فارسی کی معروف مثنویوں کے مانند حمد ایزدباری، نعت سرورِ کائنات اور خطاب بہ مطرب کے عنوانات رکھتی ہے۔ پھر غزلوں کے اشعار ہیں جو حافظ شیرازی کی مختلف غزلوں کی تقلید میں کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت سیدنا ابوالعلاء کی مدح سرائی ہے۔ سیدنا ابوالعلاء کی منقبتوں کے علاوہ دوسرے سلاسل کے بزرگوں کی بھی منقبتیں ہیں۔ مثلاً خواجہ فضیل عیاض، حضرت ابراہیم ادھم، خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین اور خواجہ بختیار کاکی وغیرہ۔

مثنوی کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے:

از ہمہ راہ رہِ فقر چہ دلخواہ بود　　زانکہ الفقرازاتم ہواللہ بود

اس کے بعد حضرت ابوالعلا کے فضل وکمال اور عظمت وجلال کو حضرت ثبات نے رغبت وشوق کے ساتھ منظوم کیا ہے۔ خطاب بہ مطرب کے زیر عنوان بھی نہایت موثر اور دل انگیز اشعار ہیں۔ ان اشعار میں شور وشیفتگی کے کوائف ملتے ہیں۔ حضرت ثبات

نے اپنے عواطف قلبی کا اظہار نہایت دردمندانہ انداز میں کیا ہے۔اس مثنوی میں حضرت ثبات کی غزلیں بھی ہیں جو انھوں نے خواجہ حافظؔ کی پیروی میں لکھی ہیں ۔ان غزلوں پر خواجہ حافظ کے شور و شیفتگی ،سرمستی و مدہوشی کا استیلا واضح طور پر نظر آتا ہے ۔حضرت ثبات کی کچھ غزلوں کے اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

پایم از کفش و سرم از کلہ آزاد آمد دل بہ عشق تو زغمہای جہان شاد آمد
درسر لیلیٰ و شیرین دلِ قیس و فرہاد درجہان کیست کہ از بند غم آزاد آمد
مردن و سوختن و ساختن و آشفتن از یکی عشق بدھر این ہمہ بیداد آمد
ہستیِ خویشتنم گشت فراموش ثبات ہرگہ آن شوخ بہشت نظرم یاد آمد

اس جہان میں عشق کی قید و بندش سے کسی کو آزادی نہیں ہے۔انسان کی زندگی میں یمن و عسرت ،فرج و شدت ،اقبال و ادبار کے سارے اوضاع کا موجب عشق ہے۔اسی خیال کو ثبات نے یہاں شاعرانہ سلیقہ مندی سے بیان کیا ہے۔

حضرت ثبات نے کچھ اور غزلیں حافظؔ کی تقلید میں کہی ہیں مثلاً ایک غزل کا مطلع اس طرح ہے:

جان فدا کن بسر یار کہ جان این ہمہ نیست وز جہان روی بگردان کہ جہان این ہمہ نیست

ثباتؔ کی یہ غزل حافظؔ کی اس غزل کی تقلید میں ہے جس کے مطلع کا مصرعۂ اول بقرار زیرین ہے۔

حاصل کارگہ کون و مکان این ہمہ نیست

حضرت ثبات کی غزل کا دوسرا شعر جو اس طرح میں کہا گیا ہے وہ بقرار ذیل ہے:

در بتان جلوۂ انوار خدا می بینم ورنہ مارا غرض از روی بتان اینہمہ نیست

اس شعر کی معنوی کیفیت پر حافظؔ کے درج ذیل شعر کا عکس ہے:

مرا بکار جہان ہرگز التفات نبود رخ تو درنظر من چنین خوشش آراست

حضرت ثبات کے درج ذیل اشعار حافظؔ کی اس غزل کی پیروی میں ہیں جس

کا مطلع اس طرح ہے:

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

ثبات کے اشعار اس طرح ہیں:

در ازل چون زغم عشق براتم دادند از غم و غصۂ کونین نجاتم دادند
ہم سراپا بدرون مظہر ذاتم کردند ہم ببرخلعت زیبای صفاتم دادند
شافع روز جزا آنکہ شد از روز ازل سایۂ دامن او در عرفاتم دادند

حضرت ثبات کی غزلوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے لیکن جو ہیں ان میں معنوی لطافت اور لسانی پاکیزگی کی صفات موجود ہیں ۔ اور یہ بلاشبہ خواجہ حافظ کی کامیاب تقلید کی مثالیں ہیں۔ یہ غزلیں عارفانہ وعاشقانہ ہیں لیکن ان میں ان کی مثنویوں کے مرموز موارد نہیں ملتے ۔ ان غزلوں میں وہ اپنے مخصوص صوفیانہ تمایل سے جدا نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے شاعرانہ ذوق کا ثبوت ہیں۔ ایک وارفتگی و والہانہ انداز ان کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

روضۃ النعیم:

شاہ امین احمد کی پانچویں مثنوی روضۃ النعیم ۱۳۰۱ھ میں مطبع اشرف الاخبار بہار شریف میں طباعت پذیر ہوئی۔ یہ مثنوی بھی بزرگوں کے مناقب سے متعلق ہے۔ حمد ایزدمنّان اور نعت رسول کریم کے بعد اوّلین منقبت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی تکریم وتعظیم کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت سید اسد اللہ اور شاہ محمد منعم وغیرہ کے مناقب ہیں۔ حضرت ثبات نے غوث الاعظم کی زندگی کے اہم واقعات، کشف وکرامات، فضائل وکمالات کو دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔
چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

حضرت شیخ جہان سید عبدالقادر آنکہ انواع کرامات شد از وی صادر
بومحمد بودش کنیت و محی الدین نام کہ وجودش پی اسلام وہدی محی عظام

از سوی ام علوی بود وحسینی بہ نسب بود آمادہ پی تربیتش رحمت رب

حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کی سرگذشت حیات کے بیان کے ضمن میں ان کے ایک محیر العقول روحانی ماجرا کو نہایت نغز و لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔اس ماجرا سے متعلق چند اشعار مثالاً نقل کیے جاتے ہیں:

درہمان وقت یکی خام قلندر آمد سخت گستاخ و بد انجام قلندر آمد
پنج صدتن زقفایش ہمہ چون ظل پس او ہمزبان ،ہمقدم وہمدم ویکدل پس او
چون قلندر بسرش ہرزہ درائی سرکرد سرچو گستاخ بہ بیہودہ سرائی برکرد
گفت فرما کہ خطابت بہ جہانگیر کہ داد درگدائی لقب شہ بتوای میر کہ داد
میر فرمود مرا پیر جہانگیر بگفت فقررا سلطنتی خواند و مرا میر بگفت

اس مثنوی میں منظوم حکایتیں بھی ہیں جو پند آموز وعبرت انگیز ہیں ۔یہ حکایتیں بوستان سعدی کی حکایات کے تحت تاثیر لکھی گئی ہیں۔مثنوی کے آخر میں حضرت ثبات کے دو تاریخی قطعات ہیں۔قطعہ اول سے مثنوی سرائی کے آغاز کا پتہ چلتا ہے جو ۱۲۹۹ھ ہے اور دوسرے قطعہ سے سال طباعت کی اطلاع ملتی ہے جو ۱۳۰۱ھ ہے۔

شہد وشیر:

حضرت امین احمد ثبات کی چھٹی مثنوی ''شہد وشیر'' کے نام سے موسوم ہے۔یہ ایک مختصر مثنوی ہے اور فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کے وزن میں منظوم ہوئی ہے۔حضرت ثبات نے یہ مثنوی پیرانہ سری کے ایام میں منظوم کی تھی جب ضعف بصارت ان پر مستولی ہو چکا تھا اور نوشت وخواند کا کام تقریباً چھوڑ چکے تھے۔یہ مثنوی ایک ایرانی شاعر کی مثنوی بعنوان ''نان وپنیر'' کے جواب میں حضرت ثبات کو منظوم کرنی پڑی تھی۔مثنوی نان وپنیر کے مصنف نے طبقۂ صوفیا اور ان کے شیوۂ زندگی کو ہدف تحقیر وتنقیص بنایا تھا اور نظام تصوف کے جملہ عناصر وامور سے اپنی اہانت ونفرت کا اظہار کیا تھا۔حضرت ثبات صوفیوں کے بارے میں ایرانی شاعر کے مذموم ومستہجن خیالات سے بے حد رنجیدہ

ہوئے تھے۔انھوں نے اس شنعت آمیز ونفاق انگیز منظومہ کا جواب دینا اپنا اخلاقی وظیفہ سمجھا۔چنانچہ مثنوی بہٰذ العنوان 'شہد وشیر' اسی بناپر معرض تخلیق میں آئی۔حضرت ثبات نے دلائل کی روشنی میں یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ صوفیوں کا مسلک وہی ہے جو رسول کریم اور حضرت علی مرتضیٰ کا مسلک تھا۔انھوں نے مشرب صوفیا کی مدافعت اپنے مثنوی میں بڑی سنجیدگی اور صبر وتحمل کے ساتھ کی ہے۔ایرانی شاعر کے شنیع وشرانگیز اور نہایت مفسدانہ خیالات کے باوجود ان کے شعروں میں انتقامی جذبہ وغصہ کے نشانات نہیں ملتے۔حضرت ثبات کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

مقتدای صوفیان خود مصطفیٰ است | باز بر جالیش علی مرتضیٰ است
واندرین امت تصوف را بنا | کرد در ہر سو علیؑ مرتضیٰ است
بعد از وی جعفر صادق بود | آنکہ قولش حجت ناطق بود
سرگروہ صوفیان باشد علی | کش ہمہ سر حقیقت منجلی

حضرت ثبات لفظ صوفی کے مفہوم کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

اہل صفہ جملہ صوفی بودہ اند | در رہِ فقر آنکہ جان فرسودہ اند
صوفی از صفوت بود یا از صفا | حلم و صبرش بر جفا و برقضا

صوفی کا مقصد زیست عشق ہے۔یہ ایک خلل ناپذیر دولت ہے۔خلق کائنات کا سبب عشق کے سوا کچھ نہیں۔حضرت ثبات کہتے ہیں:

بودش از آدم فقط این مدعا | تا بازد عشق بازی باخدا
ورنہ از بہر عبادت بیگمان | بہر حق بودند بس قدوسیان

اس مثنوی میں سبب تألیف کا حصہ اس زمانے کے اجتماعی حالات کے پیش نظر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔حضرت امین احمد ثبات ایک صاحب نظر صوفی تھے۔سجادگی کے جملہ وظائف کو نہایت صادقانہ طور پر انجام دیتے تھے۔اپنے اعمال میں آداب شریعت سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ان کی طبیعت میں تکلف وتصنع کا کوئی شائبہ نہیں تھا اور ریاکاری سے وہ حذر کرتے تھے۔وہ بلاشبہ اپنے باطنی واخلاقی محاسن ومزایا

کی بنا پر اس زمانے کے دوسرے سجادہ نشینوں سے مختلف تھے۔ لیکن نیکو کاروں کو خباثت پسند اور کج فہم لوگ الزام واتہام کا نشانہ بنانا نہیں چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے علماء ظاہر دار نے ان کے طریقۂ تصوف، وجد و حال اور رقص وسماع پر ایراد واعتراض کیا اور ان کے صوفیانہ اصول واطوار کو مورد تنقیص بنایا۔ حضرت ثبات کو ایسے کم ظرف لوگوں کی ناروا حرف گیری ناگوار گزری۔ انھوں نے اپنی درویشانہ زندگی کی طرز وروش کی مدافعت میں صادق و باصفا عرفا وفقرا کے واقعات زندگی اور مناقب کو مثنوی کے پیرایہ میں بیان کیا۔ اس سلسلے کے چند اشعار بشرح ذیل ہیں:

اندرین دور پدید آمده اند اندر شہر — آن کسانیکہ ندارند ز حق جویی بہر
کاملان را ببرند این ہمہ چون خویش گمان — عالم بوالعجبی ہاست از این بوالحکمان
گاه سرکش صفت آتشی و گاه زبون — در برشان ست قبای کہ بود بوقلمون
رود ازدیدۂ شان نوم زپا کوفتنم — کوفت بیند دل این قوم زپا کوفتنم

یہ مثنوی فکر وفن کے اعتبار سے حضرت ثبات کی بہترین تخلیق ہے۔ بزرگان فردوسیہ کے مناقب کے بیان کے ساتھ تصوف کے افکار ونکات کو مثنوی نگار نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ منظوم کیا ہے۔ اشعار میں بڑی سلاست وروانی کی صورت ہے۔ اگر چہ تصوف کے غوامض کو شعری لباس دینا سہل نہیں ہے لیکن حضرت ثبات نے اپنی شاعرانہ چابک دستی کا کمال نہایت مبرہن طور پر دکھایا ہے۔

عبرت افزا:

عبرت افزا حضرت ثبات کی ساتویں مثنوی ہے۔ یہ مثنوی بھی حضرت نے اپنی شام زندگی میں لکھی تھی۔ یونین پریس بانکی پور میں یہ مثنوی طبع ہو چکی ہے۔ ہیئتی اعتبار سے اس مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ چار مختلف بحروں میں لکھی گئی ہے۔ خمسۂ نظامی میں شامل چار مثنویوں کے اوزان کی تقلید کی گئی ہے۔ مثنوی کے پانچویں جزو کے لیے پانچویں بحر کو بروئے کار لانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ وہ پانچویں بحر میں مثنوی سرائی نہ کر سکے۔

جزو اول اس مثنوی کا مفعول مفاعلن فعولن کے وزن میں ہے اور حمد ونعت اور

ماضی کے مشائخ کبار کی مدح ومنقبت کے بعد حضرت داوٗدؑ اور حضرت شمویل کے واقعات زندگی پر مشتمل ہے۔ چنداشعاراس جزو کےاس طرح ہیں:

ای آنکہ برای گفتن راز　　ہردم در تو بروی من باز

با این ہمہ ما بگاہ حاجات　　غافل ز تو در رہ مناجات

دانند بعقل دور بینان　　نزدیک تری ز ہمنشینان

جزودوم کاوزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن ہے۔اس جزو میں حمد ونعت کے بعد حضرت جرجیس پیغمبر کی داستان بیان کی گئی ہے۔اس جزو کے چند نعتیہ اشعار اس طرح ہیں:

رسولی کش خدا آمد طلبکار　　باو شوق لقایش کرد اظہار

طلبگار خدا ہرانس و جان است　　طلبگارش خدای دوجہان است

رسولِ ابطحی ختم رسولان　　قبولِ مقبل صاحب قبولان

جزوسوم فاعلاتن مفاعلن فعلن کے وزن پر مبنی ہے۔اس حصے میں حمد ونعت کے بعد حضرت ارمیانبی کا شرح حال بیان ہوا ہے۔

اس مثنوی کے چوتھے جزو میں فعولن فعولن فعولن فعل وزن کا استعمال ہوا ہے۔ اورحمد ونعت کے بعد حضرت شمعون پیغمبر کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔چنداشعارحمد کے اس طرح ہیں:

بنام خداوند عرش برین　　بہر بندہ بیش از رگ جان قرین

خدای زمین و زمان آفرین　　طبق بر طبق آسمان آفرین

مبرا زضد و ز شبہ و نظیر　　شہنشہ ولی بی مشیر و وزیر

دہد در دل از عشق سوز و گداز　　بسوی حقیقت کشد از مجاز

حضرت ثباتؔ کی ذکاوت اور حافظہ کی قوت حیرت انگیز تھی۔ محض اکیس سال کی عمر میں جملہ علوم کی تحصیل کومکمل کرلیا تھا جس سے ان کی ذہانت اور ذوق خداداد کا اندازہ ہوتا ہے۔حضرت ثباتؔ کے اساتذہ بھی ان کی دراکی اورتیزیٔ فہم کے ستائش گر ہیں۔ان کے استادسیدوزیرالدین کہتے ہیں:

''میں جناب حضور کو پڑھاتا نہ تھا بلکہ خود پڑھتا تھا کیونکہ میں رات کو اچھی طرح کتاب دیکھ لیا کرتا تھا اور حضرت سلامت بغیر مطالعہ دیکھے پڑھنے کو آجاتے تھے اور ایسے ایسے مطالب بیان کرتے تھے کہ فی الواقع اس طرف میرا ذہن بھی نہ گیا ہوتا تھا۔ یہ رنگ ہدایہ کے پڑھنے کے وقت تھا۔''

ایک دوسرے استاد مولانا محمد موسیٰ لکھتے ہیں:

''درس وتدریس سے ہم کو برابر کام رہا ہے اور اب تک ہے۔ مگر کل ڈھائی آدمی ذہین ملے ہیں۔ اعلیٰ درجہ میاں صاحب کا ہے۔''

حضرت امین احمد ثبات اپنے پدر محترم شاہ امیر الدین کی ہدایت کے مطابق سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ شیخ پورہ (بہار) سید شاہ جمال علی بلخی کے دست بامیمنت پر ۷رشوال ۱۲۷۱ھ کو بیعت ہوئے تھے۔ حضرت سید جمال علی بلخی کے علاوہ انھیں حضرت شاہ ولایت علی، اپنے استاد حضرت مولانا موسیٰ چشتی اور اپنے والد محترم شاہ امیر الدین فردوسی سے بھی اجازت حاصل تھی۔ حضرت شاہ جمال علی بلخی نے انھیں اپنی خلافت سے بھی مشرف فرمایا۔ حضرت شاہ ولایت علی نے بھی جوان کے مرشد ثانی ہوئے بڑی محبت سے ان کی رہنمائی کی اور اجازت وخلافت سے نوازا۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ اور کسی سے حضرت ثبات نے کسب فیض نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

جز پیرو سوای مرشد خویش رشدی نگرفتہ ام کم و بیش

ایک دوسرے شعر میں اپنی ارادت کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہیں:

مارا کہ بہ غیر بدظنی نیست از غیر دو فیض باطنی نیست

حضرت امین احمد ثباتؔ کی وفات ۷۲رسال کی عمر میں ۴رجمادی الآخر ۱۳۲۱ھ مطابق ۲۹راگست ۱۹۰۳ء کو ہوئی۔

☆☆☆

مآخذ ومنابع

۱- اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی

۲- بزم صوفیہ، صباح الدین عبدالرحمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ

۳- تاریخ مگدھ، فصیح الدین بلخی

۴- تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی

۵- تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی

۶- تاریخ سلسلۂ فردوسیہ، محمد معین الدین دردائی، مطبع تاج پریس، گیا

۷- حسین نوشۂ توحید- حیات وخدمات، پروفیسر شاکر یحییٰ خلیق (دربھنگہ)

۸- خوان پُر نعمت - مجموعۂ ملفوظات حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری، مطبع احمدی پٹنہ، ۱۳۲۱ھ

۹- دیوان مخدوم احمد لنگر دریا بلخی

۱۰- روضۃ النعیم، مثنوی حضرت امین احمد ثبات

۱۱- سلسلۃ الآلی، مثنوی حضرت امین احمد ثبات

۱۲- شاہ امین احمد فردوسی- حیات وآثار، ڈاکٹر علی ارشد مقالہ تحقیق، غیر مطبوعہ

۱۳- عربی، فارسی اور علوم اسلامی میں بہار کا حصہ - مقالات کا مجموعہ، ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ

۱۴- عبرت افزا، مثنوی شاہ امین احمد ثبات

۱۵- کاشف الاسرار، مخدوم حسن دائم جشن

۱۶- گل بہشتی، مثنوی شاہ امین احمد ثبات
۱۷- گل فردوس، مثنوی شاہ امین احمد ثبات
۱۸- معدن المعانی، مجموعہ ملفوظات حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء
۱۹- مخ المعانی، مجموعۂ ملفوظات حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری
۲۰- مکتوبات صدی، مجموعہ مکتوبات حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیری
۲۱- مونس القلوب، حضرت احمد لنگر دریا بلخی، خطی
۲۲- مناقب الاصفیا، مخدوم شاہ شعیب فردوسی
۲۳- مجموعۂ اشعار مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی، مرتبہ پروفیسر سید حسن
۲۴- مکتوبات و ملفوظات صوفیا، رسالۂ تحقیق، مرتبہ پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی زبان میں)
۲۵- وسیلۃ الشرف وذریعۂ دولت، سید شاہ فرزند علی صوفی
۲۶- ہندوستان میں تصوف، آلِ احمد سرور
27- Collected works of Prof. S.H.Askari, Khuda Bakhsh Oriental Library, Patna.
28- Sufism in India vol. I, edited by Masud Khan,Anmol Publications, New Delhi
29- A Short History of Sufism in India, Vols. I & II by Saiyid Athar Abbas Rizvi.

☆☆☆

Mashaikh-e-Firdauṩia ki Ilmi wa Irfani Khidmāt ka ek Muṭāla'a

Prof. Anwar Ahmad

Institute of Persian Research
Aligarh Muslim University
Aligarh